اکتوبر 2003

ماہنامہ

اردو دنیا نئی دہلی

علی محمد خُسرو

(یکم مئی 1925 ۔ 24 / اگست 2003)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی
محکمہ ثانوی و اعلا تعلیم، وزارتِ ترقیِ انسانی وسائل، حکومتِ ہند

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

چاند پر چہل قدمی

مصنف: جے پرکاش بھارتی

اس کتاب میں بے حد دلچسپ انداز میں چار کرداروں کی مدد سے چاند سے متعلق جدید معلومات پیش کی گئی ہیں۔ بچوں کے لیے یہ کتاب بے حد معلوماتی ہے اور کھیل کھیل میں انھیں بہت سی جانکاریاں فراہم کرتی ہے۔

تیسرا ایڈیشن، صفحات : 64، قیمت : -/14 روپے

ہندوستان کی بزرگ ہستیاں

مصنف: صفدر حسین

اس کتاب میں ہندوستان کی چند عظیم شخصیات گوتم بدھ، شنکر اچاریہ، خواجہ معین الدین چشتی، گرونانک، فریدالدین گنج شکر، میرابائی، تلسی داس، دیانند سرسوتی اور رام کرشن پرم ہنس کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ بچوں کو ان بزرگ ہستیوں کے حالات زندگی سے نہ صرف بھرپور واقفیت حاصل ہوگی بلکہ ان میں خود کو بہتر بنانے اور قوم اور ملک کی خدمت کا جذبہ بھی بیدار ہوگا۔

پہلا ایڈیشن، صفحات: 87، قیمت: -/13 روپے

فسانۂ عجائب

مصنف: ڈاکٹر نورالحسن نقوی

یہ رجب علی بیگ سرور کی مشہور کتاب ہے جو پر تکلف عبارت اور مشکل اسلوب کے لیے مشہور ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن نقوی نے بچوں کے لیے اسے آسان زبان میں منتقل کر دیا ہے۔ اس میں قصے سے قصہ نکلتا ہے اور کسا ہوا پلاٹ بھی موجود ہے۔

تیسرا ایڈیشن، صفحات: 83، قیمت: -/16 روپے

انوار سہیلی کی کہانیاں

مصنف: ملا حسین واعظ کاشفی

ملا حسین واعظ کاشفی کی مشہور کتاب سے 46 منتخب کہانیاں جو دلچسپ بھی ہیں اور اخلاقیات کا درس بھی دیتی ہیں۔ جانوروں کی زبانی انسانی زندگی کی حقیقتوں کی ترجمانی۔ بچوں اور بڑوں دونوں کے لیے — کہانیوں کا انتخاب اور ترجمہ: ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی

دوسرا ایڈیشن، صفحات : 93، قیمت : -/23 روپے

تنقید عقل محض

مصنف: ایمانوئل کانٹ، مترجم: ڈاکٹر سید عابد حسین

جرمن فلسفی کانٹ اور اس کی اس مشہور و معروف کتاب کو جدید فلسفے میں بے حد اہمیت حاصل ہے۔ اس کتاب کا موضوع بحث فلسفے کا سب سے نازک مسئلہ یعنی نظریۂ علم ہے۔ اس ترجمے میں جو اصل کتاب سے براہ راست کیا گیا ہے، نفس مضمون کو صحت، سلاست اور وضاحت کے ساتھ ادا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

صفحات: 488، قیمت: -/158 روپے

مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت

مصنف: ابوالکلام قاسمی

اردو شعریات کے خد و خال کے تعین کے لیے اپنی لسانی اور ادبی جڑوں کی کھوج اور ان کی بازیافت ضروری ہے۔ اس کتاب میں عربی اور فارسی شعریات کے ان عناصر کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔ جن کو اردو شعریات کی تشکیل میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

صفحات: 382، قیمت: -/124 روپے

[illegible]

مصنف: محمد اطہر علی، مترجم: امین الدین

اورنگ زیب کا عہد حکومت (1658-1707) مغل سلطنت کا دور عروج بھی ہے اور اس عظیم سلطنت کے زوال کا نقطۂ آغاز بھی۔ عروج و زوال کی اس کہانی میں اس کے دربار کے مغل امرا نے دانستہ یا نادانستہ کیا کردار ادا کیا، یہ کتاب اس سوال کا تفصیلی جواب پیش کرتی ہے۔

دوسرا ایڈیشن، صفحات 350، قیمت -/120 روپے

[illegible]

مصنف: نصیر الدین ہاشمی

اردو جس گنگا جمنی تہذیب کی ترجمان ہے، اس کی تشکیل میں برصغیر ہند کی سبھی مذہبی اکائیاں شامل رہی ہیں۔ دکن میں جن ہندو شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں نے اردو کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا ان فنکاروں کے کام کا تعارف۔

دوسرا ایڈیشن، صفحات 298، قیمت -/111 روپے

[illegible]

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

ماہ نامہ

اردو دُنیا نئی دہلی

جلد۔5، شمارہ۔10 اکتوبر 2003

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

معاون مدیر: ارجمند آرا

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

کمپوزنگ: قومی اُردو کونسل

مطبع: جے کے آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی 6

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اُردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

چیک یا ڈرافٹ NCPUL کے نام روانہ کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی - 066 110
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26179657 26
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746

شاخ: 5-4-4/435/20، گرین ہاؤس،
اسٹیشن روڈ، نام پلی، حیدرآباد 500001 (A.P.)
فون: 24615139

اس شمارے میں

آپ کی بات .... خطوط 2

ہماری بات .... اداریہ 5

● علی محمد خسرو: مہذب دانش وری کا نقشِ جمیل (گیسٹ کالم) .... اختر الواسع 6

● احوالِ شخصی 8

● علی محمد خسرو سے گفتگو .... اختر الواسع/فرحت احساس 9

● خراجِ عقیدت .... فیروز عالم 15

● معاصر ہندستان میں اردو کی حیثیت: امکانات، خطرات اور رکاوٹیں .... عبدالرحمان مومن 17

● اردو ذریعۂ تعلیم سے سائنسی علم تک رسائی: تاریخی تناظر .... دیپک کمار 20

● زبان کی تعلیم و تدریس اور تہذیبی بقا .... ہریش نارنگ 22

● اردو — دوسری سرکاری زبان اور ہماری ذمّے داریاں .... جمیل اختر 25

● تنظیمِ کتب خانہ میں کمپیوٹر .... حبیب الرحمان چغانی 27

● عورتوں کے تئیں دوہرا رویّہ .... فضیل احمد خاں 31

● ہندستانی مردم شماری: خانگی جائزہ .... رو ہت سرن 33

● پلاسٹک: مفید یا مضر؟ .... ریاض ملک 35

گوشۂ ادب:

● چننی میں اردو نثر .... علیم صبا نویدی 37

گوشۂ فروغِ کتب

● لکھنؤ (فسانۂ آزاد سے اقتباس) .... رتن ناتھ سرشار 41

● جان کمپنی سے جمہوریہ تک جدید ہندستان کی کہانی (اقتباس) .... مشیر الحسن 44

طلبہ کے لیے

● سرکاری قومی روزگار کے امتحانات (کیرئیر گائیڈنس) .... سلمان عابد 48

● انٹرنیٹ گائیڈ .... نعیم احسن 50

● کوئز (اردو ادب) .... فیروز عالم 52

● بڑھتے قدم (کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-3) .... محمد سہیم الدین 55

اُردو خبرنامہ .... ادارہ 56

تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 69

● پھولبن (دوسرا ایڈیشن)/ ابنِ نشاطی .... مبصر: مخمور سعیدی

● ثانوی مدارس میں تدریس/ نیلسن ایل. بوسنگ .... مبصر: ظفر احمد نظامی

● ہندستانی گاؤں/ ڈاکٹر شیاما چرن دوبے .... مبصر: احمد کفیل

● اودھ کے فارسی گو شعرا/ ڈاکٹر زہرہ فاروقی .... مبصر: مہتاب جہاں

● آزادی مبارک اور دوسری منتخب کہانیاں/ کملیشور .... مبصر: اظہار احمد ندیم

● یوجنا (یومِ آزادی، خصوصی شمارہ) اگست 2003

بچوں کا گوشہ

● سرسید احمد خاں ("ہمارے رہنما"، جلد-9 سے اقتباس) .... انیتا مہاجن 74

● نمک ستیہ گرہ کا سپاہی ("نمک ستیہ گرہ کا سپاہی" سے اقتباس) .... سروجنی سنہا 79

آپ کی بات

■ **جیلانی بانو، ہدیٰ ہائٹس-71، روڈ نمبر-12، بنجارہ ہلز، حیدرآباد**

''اردو دنیا'' مسلسل مل رہا ہے۔ شکریہ۔ اردو کے تعلق سے اس میں اہم مضامین آرہے ہیں۔ خصوصاً اردو کے کلاسیکی ادب پر ''اردو دنیا'' زیادہ توجہ دے رہا ہے۔ یہ اہم کام ہے۔ روسی ادیب اور نقاد شیخا چوف کے انتقال کی خبر ''اردو دنیا'' میں دیکھی۔ بہت دکھ ہوا۔ ہم اردو سے بے پناہ محبت کرنے والے ایک ادیب اور نقاد سے محروم ہوگئے۔ انھوں نے اردو کے نئے اور پرانے لکھنے والوں کے روسی اور ازبک زبان میں بہت سے ترجمے کیے تھے۔ میری بھی دس بارہ کہانیوں کا ترجمہ روسی اور ازبک زبان میں کیا ہے۔ ''اردو دنیا'' میں ان کے کاموں کے بارے میں جو تفصیل ہے، اس میں کچھ باتیں رہ گئی ہیں۔ شیخا چوف نے مخدوم کی شاعری اور زندگی پر ایک کتاب لکھی تھی۔ ان کی نگرانی میں تاشقند کے ریسرچ اسکالر دلادوسوکولوف میری کہانیوں اور ناولوں پر ڈاکٹریٹ کر رہے تھے۔ ڈاکٹر لدا میلا داسی لیوا بھی ان کی شاگرد تھیں۔ میں روس تین بار گئی۔ ہمیشہ شیخا چوف صاحب ایک میزبان کی طرح ساتھ رہے۔ وہ بہت اچھی اردو بولتے تھے اور اردو کے ادیبوں کو دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ انھوں نے تاشقند میں ٹیگور پر ایک بہت اچھا پروگرام منعقد کیا تھا۔ شیخا چوف کے ساتھ اردو کو چاہنے والے روسی ادیب کم رہ گئے ہیں۔

■ **عنبر جہاں بنت محمد مصطفی انجینئر، کاویری ٹکسٹائل، مئوناتھ بھنجن**

ماہنامہ ''اردو دنیا'' پہلی بار اپنے بھائی کے ہاتھوں میں دیکھا، جو دہلی سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ یہ جون 2003 کا شمارہ تھا۔ میں رسائل وغیرہ بہت کم پڑھتی ہوں۔ میں 12ویں کلاس کی طالبہ ہوں۔ گھر کے کام کاج میں اتنی مصروف رہتی ہوں کہ مجھے کورس کی کتابیں پڑھنے کے لیے بھی بہت کم وقت ملتا ہے۔ رسالہ ''اردو دنیا'' کا پرکشش سرورق دیکھ کر اسے پڑھنے کی تمنا دل میں پیدا ہوئی۔ پہلے تو ذہن میں یہ تھا کہ رسالے میں غزلیں، افسانے، کہانیاں، ناول، لطیفے وغیرہ ہوں گے جیسا کہ عام طور سے اردو رسائل میں ہوتا ہے۔ مگر یہاں تو معاملہ اس کے برعکس تھا۔ پہلی بار اس قسم کا رسالہ پڑھنے کو ملا۔ کچھ مضامین تو میری سمجھ میں نہیں آئے۔ البتہ کچھ مضامین کو دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ خاص کر ''شیلا منی اثیر کا مضمون ''پانی ہے انمول'' بے حد پسند آیا۔ یہ بہت ہی اہم اور معلوماتی مضمون ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پانی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور زندگی کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ ''ہماری بات'' کے تحت آپ کے مضمون نے کافی متاثر کیا اور پہلی بار پانی کی اہمیت کا احساس ہوا۔ خدا کرے کہ ہم پانی کا صحیح استعمال کرنے والے بن جائیں۔

''اردو خبرنامہ'' پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اس سے مجھے اردو زبان و ادب کے بارے میں کافی جانکاری حاصل ہوئی۔ آپ اردو کے فروغ کے لیے جو کام کر رہے ہیں، اس کے لیے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ ''اردو دنیا'' ہمیشہ ترقی کی راہ پر گامزن رہے۔

■ **زبیر احمد بھاگلپوری، اردو شعبہ، بہار قانون ساز کونسل، پٹنہ-15**

اگست کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس بار ''ہماری بات'' کے تحت آپ کا اداریہ بہت پسند آیا۔ آپ کے اس نظریے سے میرا صد فیصد اتفاق ہے کہ دوسری سرکاری زبان بن جانے سے اردو کے چند لوگوں کو ملازمت تو مل جائے گی لیکن اردو کی ترویج و اشاعت کا مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اردو زبان کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے اردو والوں کو قوتِ ارادی اور تحریکی عزم پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے یہاں بہار میں پہلی بار راج بھاشا ایکٹ 1981 کے تحت اپریل 1981 میں پندرہ اضلاع کے لیے، پھر 14/اگست 1989 کو پورے بہار کے لیے اردو کو آئینی طور پر دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملا، لیکن یہاں بھی اس کے ساتھ وہی مسئلہ ہے جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔ تاہم بہار یا دہلی میں دوسری سرکاری زبان بن جانے کے بعد اردو نے ارتقائی سفر کا ایک سنگ میل تو طے کر ہی لیا ہے۔ آگے اگر آپ جیسے سرگرم محبِ اردو کی اسے سربراہی ملتی رہی تو منزل تک پہنچنا بھی ناممکن نہیں۔

■ **ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، سابق ممبر راجیہ سبھا،**

''اردو دنیا'' کا اگست 2003 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ نسیم احمد صاحب کا تحقیقی مضمون تسامحات، صاحبِ تیشۂ نظر — ابوالفیض سحر، اردو شاعری میں ہندو دیومالائی عناصر، مہاراشٹر میں اردو درسی کتب کی ترتیب و تدوین، اردو خبرنامہ اور طلبہ کے لیے ہندستان کی تحریک آزادی سے متعلق کوئز اور اس کے جوابات پسند آئے۔ ''اردو دنیا'' نے تحریکِ آزادی کے بارے میں کوئز اور اس کے جوابات شائع کرکے بڑی قومی خدمت انجام دی ہے اور قارئین کو تحریکِ آزادی سے روشناس کیا ہے۔ اس کے لیے وہ قابلِ صد تہنیت و مبارک باد ہے۔ لیکن چند جوابات صحیح نہیں ہیں۔ مثلاً سوال آٹھ کا صحیح جواب یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کی پہلی صدر مسز اینی بیسنٹ نے 1917 میں کانگریس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی تھی نہ کہ مسز سروجنی نائیڈو نے۔ اسی سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد کانگریس کے 1940 میں صدر تھے نہ کہ 1923 میں۔ 1923 میں کانگریس

کے صدر مولانا محمد علی جوہر تھے اور مجلس قانون ساز کے بارے میں ستمبر 1923 میں دہلی میں کانگریس کا وہ اجلاس ہوا تھا جس کی صدارت مولانا آزاد نے کی تھی اور اس اجلاس میں اس مسئلے پر کانگریس کے دونوں گروپوں میں مفاہمت ہوئی تھی۔ سوال نمبر 23 کا صحیح جواب یہ ہے کہ وارن ہیسٹنگز ہندستان کے گورنر جنرل تھے نہ کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سورت کے آخری گورنر جنرل تھے۔ خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس امرت سر میں 1919 میں مولانا شوکت علی کی صدارت میں ہوا نہ کہ فضل الحق کی صدارت میں۔

■ **بھگوان داس اعجاز، ٹی-451، بلجیت نگر، نئی دہلی-110008**

ہمارا ایک اور ساتھی ہاتھ چھڑا کر چلا گیا۔ بجھے بجھے من سے مخمور سعیدی کی ''کچھ یادیں کچھ باتیں'' پڑھیں۔ امیر کی نظمیں زندگی کے دو روپ ''صبح و شام'' کی علامت ہیں اور غزلیات کے بیشتر اشعار اسی کی آواز میں کان میں گونجنے لگے ہیں۔ خدا اسے اپنی جوار میں پناہ دے..... آمین!

■ **نیر اقبال علوی، ہینڈ ویگ-61، 60316، فرینکفرٹ/مین، جرمنی**

آپ کے اردو مجلے کی بدولت آپ سے شناسائی ہوئی۔ سب سے پہلے تو آپ کو بہت بہت مبارک کہ جس محنت اور لگن کے ساتھ اتنا خوبصورت، دیدہ زیب اور معیاری ماہنامہ شائع کر رہے ہیں، وہ قابلِ تحسین بھی ہے اور قابلِ داد بھی۔ کیونکہ اس کے ذریعے اردو زبان کی ترویج و ترقی کا کام بھی ہو رہا ہے۔ ایک مرتبہ پھر آپ کو اور آپ کی ٹیم کو بہت بہت مبارک۔

میں لاہور کا رہنے والا پاکستانی ہوں لیکن بسلسلۂ روزگار گذشتہ تیس برس سے فرینکفرٹ میں مقیم ہوں۔ بچپن سے ادب کا قاری ہوں۔

■ **اشرف النسا۔ حافظ منزل، ملارنا ڈونگر، سوائی مادھوپور، راجستھان**

ماہنامہ ''اردو دنیا'' کا اگست کا شمارہ پیشِ نظر ہے۔ جریدے کے سرِ ورق نے سب سے پہلے متاثر کیا اور یہی خط لکھنے کا باعث بھی ہوا۔ آپ کی جانب سے ''اردو دنیا'' کے قارئین کو یوم آزادی کی مبارک باد پر بحیثیت ایک قاری کے اظہارِ تشکر کے علاوہ میرے پاس کچھ بھی تو نہیں۔ سرِ ورق پر ہمارے ''ترنگے'' کا عکس اور صاحبانِ اردو کو کمپیوٹر سے متعارف کرانے اور اس سے وابستگی کے چار کامیاب سالوں کا اجمالاً خاکہ آپ کے حسنِ انتخاب کی داد دیتا ہے۔

آپ کا اداریہ جو دہلی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے سے متعلق ہے، بصیرت افروز ہونے کے ساتھ ساتھ غور و فکر کی دعوت بھی دیتا ہے۔

مشمولہ مضامین میں 'ہندستان میں فارسی زبان کا فروغ' (گیسٹ کالم) از مرلی منوہر جوشی، مہاراشٹر میں اردو درسی کتب کی ترتیب و تدوین، از غلام نبی مومن اور چین و ہندستان میں غیر ملکی سرمایہ کاری از بھرت جھنجھن والا، بڑی محنت سے لکھے گئے ہیں۔ حکیم اشہر قدیر کا مضمون بھی طبی معلومات کے اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔

گوشۂ ادب و ثقافت، کے ذیل میں ''صاحب تیشۂ نظر— ابوالفیض سحر'' ایک مکمل اور جامع مضمون ہے محترم مخمور سعیدی کی قوتِ بیانی پر دال ہے۔ محمد سہیم الدین ندوی کا تحریر کردہ ''کوئز'' (ہندستان کی تحریکِ آزادی) متعلقہ موضوع کا پوری طرح احاطہ کرتا ہے۔

''اردو خبر نامہ'' کے مطالعے سے ادبی دنیا کی جملہ سرگرمیوں اور فتوحات سے واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ ''تبصرہ و تعارف'' میں بحیثیت مبصرین ارشد علی خاں، ظفر احمد نظامی اور ڈاکٹر آر. کے. بھٹ نے بہت متاثر کیا۔

اس پُرکشش اور معلومات افزا رسالے کے اوصاف حمیدہ ''آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری'' کے مصداق ہیں۔ اس پر مبارکباد قبول فرمائیں۔

■ **سید صفی اللہ، ای-4، ہالٹر ٹاورس، ہالٹر روڈ، ایگمور، چنئی-600008**

اس میں کوئی شک نہیں کہ ''اردو دنیا'' قارئین میں ایک نئے ذہن کی تشکیل میں لگا ہوا ہے۔ وہ قاری جو روایتی انداز کے رسائل پڑھنے کے عادی ہیں، اب ''اردو دنیا'' کی دوستی سے خود کو آشنا کرنے لگے ہیں۔ تنوع کے ساتھ موضوعات کا امتزاج اس کی خوبی بن گئی ہے۔ ''اردو دنیا'' کے ستمبر کے شمارے میں ''تعلیم میں اقدار کا بحران'' اہم مضمون ہے۔

دراصل یہ بات کہ طلبا کا اوّلین مقصد حصولِ تعلیم ہے، ہم نے ان کے ذہنوں سے اسی وقت نکال دیا جب ملک کی آزادی کی جدوجہد میں انھیں استعمال کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج یہ مرض کالج اور یونیورسٹی کی زندگی کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ سیاست تو یہیں سے شروع ہو جاتی ہے اور کچھ طلبہ باقاعدہ اپنا سیاسی مستقبل یہیں سے بنانا شروع کر دیتے ہیں۔

سچ ہے کہ خود اساتذہ آج درندے بن رہے ہیں، خاص طور پر سائنس اور حساب کے اسباق پڑھانے والے۔ ابھی دو دن پیشتر 6 ستمبر کے ''دی ہندو'' چنئی ایڈیشن میں یہ خبر چھپی ہے کہ تمل ناڈو کے ایک شہر مدورائی کے ایک ہائر سیکنڈری اسکول کے طالب علم نے کیمسٹری کے استاد کے ظلم و ناروا رویے سے تنگ آکر خودکشی کر لی۔ 17 سالہ محمد ناصر علی نے اپنی چٹھی میں لکھا ہے کہ کلاس میں وہ استاد طرح طرح سے اسے تنگ اور شرمندہ کرتا تھا۔ آخر ظلم نہ سہہ کر اس نے زہر کھالیا۔ کلاس کے دوسرے لڑکوں سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ آخر یہ سلسلہ کہاں جاکر رکے گا؟

■ **امتیاز الدین، 3-5-805، حیدر گوڑہ، حیدرآباد-500029**

تازہ شمارے میں بھیشم ساہنی پر آپ کا اداریہ، قمر رئیس صاحب کا مضمون اور خود ساہنی جی کی کہانی پڑھ کر دل بہت اداس ہو گیا۔ بھیشم ساہنی جیسی شخصیتیں

روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔ آج کے دور میں جب کہ وسیع النظری اور فراخیِ قلب کی بے حد ضرورت ہے، بھیشم ساہنی جیسی دل نواز ہستیوں کا دنیا سے اٹھ جانا ایک المیہ ہے۔ آپ نے ان کی یاد میں جو صفحات وقف کیے ہیں، وہ ان کے لیے اردو دنیا کا خراج ہے۔

■ سید مقتدیٰ حسین ہاشمی (علیگ)، لائبریرین، 105/130، سعید آباد، چمن گنج، کانپور

میں ماہنامہ "اردو دنیا" کا مستقل خریدار ہوں۔ میرے علاوہ گھر کے سبھی ممبران اور احباب بھی اسے دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ یہ رسالہ ہر لحاظ سے بہت مفید ہے کیونکہ ہر طرح کے موضوع کا احاطہ کرتا ہے جس سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، خصوصاً بی اے، ایم اے (اردو) کے طالب علموں کے لیے تو یہ بہت کارآمد ہے۔ اس کی کتابت، چھپائی وغیرہ بہت ہی خوبصورت ہے، دیدہ زیب ہے۔ ہر ایک کو پڑھنے میں خاص دلچسپی ہوتی ہے۔

■ عبدالباری تبسم کشن گنجوی، برچونڈی گولہ، پوسٹ کھارودہ، کشن گنج (بہار)

"اردو دنیا" اگست 2003 کا شمارہ "پہلی بار خریدا۔ مطالعے کے بعد رسالہ بہت دل چسپ لگا۔ خاص طور سے "طلبہ کے لیے" کے تحت "اسکول کے اقسام۔ تعلیمی مواقع"، "انٹرنیٹ گائیڈ" کے ساتھ ساتھ "بڑھتے قدم" میں مسرت خان کا انٹرویو بہت غور سے پڑھا جو اپنی محنت اور لگن سے اس مقام تک پہنچی۔

"اردو دنیا" پہلی بار پڑھا، پڑھنے کے بعد ایسا لگا کہ اب اس کے مطالعے کو معمول بنانا ہوگا کیونکہ اس سے اردو کے بارے میں ہر قسم کی جانکاری مل رہی ہے۔

■ ہیڈ ماسٹر، عثمانیہ اردو ہائی اسکول، ہوٹگی اسٹیشن، سولا پور

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی موبائل وین اردو کا ذخیرہ لیے مہاراشٹر کا دورہ کرتے ہوئے شہر سولا پور میں 20 رجولائی کو داخل ہوئی جس سے شہر سولا پور کے ہر مدرسے، پرائمری، ہائی اسکول اور کالج کے طالب علموں کے علاوہ اردو زبان کے چاہنے والوں نے بڑی تعداد میں کتابیں خریدیں۔

آپ کا یہ قدم بے حد قابلِ ستائش ہے کیونکہ اس موبائل وین کی بدولت شہر سولا پور کا اردو طبقہ ایسی کتابوں سے روشناس ہوا، جن سے اب تک انجان تھا۔ دوسری اہم بات یہ کہ ان کتابوں پر 40% رعایت بھی دی جارہی تھی جس سے غریب طبقہ بھی آسانی سے کتابیں خرید سکا۔ سولا پور میں جہاں جہاں بھی یہ موبائل وین پہنچی، وہاں پر کتابیں خریدنے کے لیے اردو والوں کی ایسی بھیڑ لگی تھی جیسے یہاں پر اردو کا میلہ لگا ہو۔

آپ اردو کی خدمت بڑے ہی خلوصِ دل سے کررہے ہیں۔ میں آپ کو اس خدمت پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین!

■ امجد جاوید، حلیمہ ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ، ایس ایف ایس-13، مگ سیکنڈ، کے ایچ بی کالونی، دکلا گیرا، نزد بلال آباد، گلبرگہ-585104

آپ کی کرم نوازی اور بھرپور تعاون کے لیے دل کی گہرائیوں سے شکرگزار ہوں۔ آپ نے 60 سے بڑھا کر 80 طلبہ و طالبات کو داخلہ لینے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ہم سبھی بے حد ممنون ہیں۔ آپ کے حسب حکم مزید کمپیوٹرس کا انتظام کرنے کی تیاری بھی بڑی تیزی و سرعت سے شروع کردی گئی ہے۔ گلبرگہ شہر کے لیے سینٹرز نہایت موزوں ہی نہیں بلکہ کامیابی سے چلنے کی ضمانت بھی ہیں۔ انشاء اللہ ہم یہاں کے کمپیوٹر سینٹرز کو بڑی کامیابی سے چلانے کی ہر دم کوشش کرتے رہیں گے۔

□□□

"اردو دنیا" اور "کتھا" کی جانب سے افسانوں کا انعامی مقابلہ

"اردو دنیا" اور "کتھا"

دعوت دیتے ہیں

اردو کے ان افسانہ نگاروں کو جن کی عمر چالیس سال سے کم ہے

اپنا بہترین افسانہ 31 راکتوبر 2003 تک درج ذیل پتے پر بھیج کر مقابلے میں شرکت فرمائیں۔

لیلا گوسوامی، کتھا، A-3، سرودیا انکلیو، شری اروبندو مارگ، نئی دہلی-110017

ٹیلیفون: 26524311، 26524350، 26521752-11-91

☆ "اردو دنیا" قومی اردو کونسل، وزارت ترقی انسانی وسائل کی جانب سے شائع ہونے والا خبروں اور نظریات وخیالات پر مشتمل اردو ماہنامہ ہے۔

☆ "کتھا" دلّی کی رضا کار تنظیم، جو ہندستان کی رنگارنگی میں ہم آہنگی اور متنوع شناختوں میں ربط پیدا کرنے کے لیے زبان اور ادب کے وسیلے سے کام کررہی ہے۔

انعامی مقابلے میں شرکت فرماکر "اردو دنیا" اور "کتھا" کے دوست بنیں۔

ہماری بات

البرٹ آئنسٹائین نے ایک بار کہا تھا کہ "کوئی بھی مسئلہ اُس سطح پر ہرگز حل نہیں کیا جاسکتا، جس سطح پر وہ پیدا ہوا تھا۔ اُس کو حل کرنے کے لیے تو بہر حال اگلی سطح تک اٹھنا پڑے گا۔" یعنی پیچیدہ مسائل کے حل کے لیے جب تک انقلابی فکر اور حکمتِ عملی اختیار نہ کی جائے صورتِ حال بدلنے کے امکانات پیدا نہیں ہوتے۔

اردو زبان کی تعلیم اور بقا کے لیے بھی یہی انقلابی فکر اور حکمتِ عملی درکار ہے۔ اردو بولنے والوں کا رویہ جب تک اپنی زبان کے تئیں نہ بدلے گا، ان کی فکر گھسے پٹے مفروضوں سے آزاد نہ ہوگی، وہ اس کے فروغ کے لیے کوئی مؤثر لائحۂ عمل تیار نہیں کر سکتے اور نہ ہی جمہوری نظام کے ایک طاقت ور پریشر گروپ کے روپ میں کام کر سکتے ہیں۔ مثلاً اردو والوں کا ایک عام مطالبہ یہ رہا کہ اس زبان کو روزگار سے جوڑا جائے۔ اس کے جواب میں اگر اسکول ٹیچر اور مترجم کے طور پر چند لوگوں کو نوکریاں مل بھی جائیں تو کیا واقعی اردو زبان کا فروغ ہوگا؟ زبان اور روزگار کو لازم وملزوم فرض کر کے ہم اردو والے یہ بھی دلیل دیتے رہتے ہیں کہ چونکہ یہ زبان روزگار کے مواقع سے وابستہ نہیں ہے اس لیے خود اردو والے بھی اس کو چھوڑتے جارہے ہیں۔ یہ بڑی حیران کن دلیل ہے۔ ہندستان میں اور بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں اور ان کے بولنے والے اپنی مادری زبان کو صرف اس لیے پڑھنا نہیں چھوڑ دیتے کہ وہ منفعت بخش نہیں ہے۔ کوئی بنگالی، کوئی پنجابی، کوئی تمل، کنڑ اور اڑیا بولنے والا روزگار کی ضرورت کے لیے دوسری زبانیں، خصوصاً انگریزی سیکھتا تو ضرور ہے، بولتا بھی ہے، لیکن اپنی تہذیبی میراث، اپنی مادری زبان سے دست بردار نہیں ہوجاتا۔ دہلی جیسے شہر میں جہاں نفسا نفسی کا عالم ہے، بہت سے لسانی گروپوں کی پوری پوری کالونیاں اور محلے آباد ہیں اور کئی نسلیں گزر جانے کے باوجود وہ اپنے تعلیمی ادارے قائم کرتے ہیں، ان کے بچے اپنی زبان میں گفتگو کرتے ہیں، اسے لکھنا پڑھنا بھی سیکھتے ہیں، اس کے برخلاف اپنے اسی گہوارے میں اردو جس کس مپرسی کے عالم میں سسک رہی ہے وہ صورتِ حال کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

دراصل روزگار سے جوڑنے کی دلیل اُس ذہنیت کی پیداوار ہے جو اردو زبان کو ابھی تک یا تو شاہی اور جاگیرداری دور کے درباروں اور امرا و رؤسا کی ڈیوڑھیوں سے وابستہ دیکھنا چاہتی ہے یا اسے ہندی کی مسابقت میں وہ اسٹیٹس دلوانا چاہتی ہے جو آزاد ہندستان میں شمالی ہند کی بہت سی ریاستوں نے ہندی کو دیا ہے ــــ یعنی سرکاری کام کاج کی زبان کا۔ ظاہر ہے کہ جو زبان سرکاری کام کاج کی زبان ہوگی، اس میں روزگار کے بہتر مواقع ہوں گے ہی لیکن اس کا مطلب یہ تو ہرگز نہیں ہے کہ میری زبان سرکاری کام کاج کی زبان نہیں ہے تو میں اسے چھوڑ دوں؟ ہزاروں سال کی بے وطنی کے باوجود یہودیوں نے اپنی تہذیبی اور لسانی میراث کو بچائے رکھا، اپنی شناخت کو قائم رکھا، اس میں تو کوئی نفع کی بات نہ تھی۔ شمالی ہندستان میں سیکڑوں سال تک فارسی اور پھر انگریزی کا غلبہ رہا۔ یہاں کے لوگوں نے ان زبانوں کو اپنے روزگار کی زبان کے طور پر اختیار کیا، فارسی کے بڑے بڑے عالم فاضل بھی پیدا کیے لیکن اپنی مادری زبانوں، اپنی تہذیبی میراث اور شناخت کو انھوں نے اپنے گھروں میں زندہ رکھا اور جب آزادی ملی تو اپنے اپنے لسانی اور تہذیبی حقوق حاصل بھی کر لیے۔

آزادی کے بعد اردو کو جس سیاسی منافرت کا شکار ہوکر زبردست نقصان اٹھانا پڑا، اس کا ازالہ روزگار میں حصے داری مانگ کر ممکن نہ ہو سکے گا۔ روزگار حاصل کرنا تو ہر شخص کا حق ہے لیکن اسے زبان سے جوڑنا کیوں کر ممکن ہے؟ جو مسئلہ جس نوعیت کا ہے، اسے اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ روزگار کا مسئلہ مذہب، تہذیب اور زبانوں سے وابستہ نہیں ہے، اس لیے اس کے مطالبات بھی دوسرے ہیں۔ زبان کی بقا کا مسئلہ اس کے بولنے والوں کی وابستگی اور اس کی بقا کے لیے کی جانے والی ایماندارانہ کوششوں سے وابستہ ہے۔ ہم اردو والوں کو چاہیے کہ اپنے اپنے دلوں میں یہ جھانک کر دیکھیں کہ کیا ہم واقعی اردو کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ہاں، تو پھر ہمارے اعمال کو اس کی گواہی دینا چاہیے۔ یعنی کیا ہم اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ زبان کسی نفع کے لیے نہیں بلکہ شخصیت کی تہذیب کے لیے پڑھی جاتی ہے۔ کیا ہم یہ سوچتے ہیں کہ مادری زبان کا علم ہمارے جذبات واحساسات کو مہمیز کرتا ہے، ہمیں زیادہ بہتر انسان بناتا ہے، ہمارے طرزِ فکر کو استقامت عطا کرتا ہے؟ اگر ہم شخصیت کی تکمیل میں مادری زبان کی تعلیم کو ضروری خیال کرتے ہیں تو یقیناً اپنے بچوں کو ان کی مادری زبان نہ صرف پڑھائیں گے بلکہ ان کی تربیت اس طرح کریں گے کہ ان کے دل میں بھی اس کی اہمیت کا احساس جاگزیں ہو اور زبان کی اس میراث کی منتقلی کا مسئلہ صرف ایک یا دو نسلوں تک محدود نہ رہے بلکہ یہ زبان اقدار کی شکل میں ایک نسل سے دوسری نسل تک مستقل طور پر اور مسلسل منتقل ہوتی رہے۔ اس طرح کا طرزِ فکر ہی اس زبان کی بقا کا ضامن بن سکتا ہے۔

جہاں تک تعلق مطالبات اور زبان کے فروغ کی سرکاری پالیسیوں کا ہے، ان کا ارتکاز صرف اور صرف ابتدائی درجات میں تعلیم کے مطالبے اور فراہمی پر کیا جائے تو وہ انقلابی نتیجے برآمد ہوں گے جو اعلا سطح پر زبان کی تعلیم و ترویج کے انصرام سے بھی نہیں ہو سکتے، کیوں کہ مادری زبان میں تعلیم بچے کا بنیادی حق ہے اور جب وہ اپنی زبان سیکھ کر اپنے جذبات واحساسات اور خیالات کا اظہار سیکھ لے گا تو نہ صرف مہذب شہری کے طور پر ان بچوں کا مستقبل روشن ہوگا بلکہ ملک و قوم کی ترقی کی راہیں بھی زیادہ روشن ہوں گی۔

اختر الواسع

گیسٹ کالم

علی محمد خسرو: مہذب دانش وری کا نقشِ جمیل

علی محمد خسرو جدید علم و دانش اور ہند اسلامی تہذیبی وجدان کے ایک مبارک و متوازن امتزاج سے تشکیل پانے والی ایک ایسی تابناک شخصیت تھے جنھوں نے آزادی کے بعد کے ہندستان کی اقتصادی اور تہذیبی تعمیرِ نو کے منظرنامے کو روشن تر کرنے میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ انھوں نے ایک طرف ماہرِ اقتصادیات کی حیثیت سے اپنی زود فہم اور تخلیقی ذہانت کی طاقت سے قومی معیشت کے نہایت پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی کوششوں کو ٹھوس نظری و عملی بنیادیں فراہم کیں تو دوسری طرف اپنی وسیع المشربی اور کشادہ قلبی کے طرزِ عمل سے یہ بھی ثابت کیا کہ سیکولر جمہوری ہندستان کی تہذیبی ترجیحات کیا ہونی چاہئیں۔

برطانوی سامراجی تسلط کے خاتمے کے بعد نو آزاد ہندستان کو کئی چیلنج درپیش تھے۔ سب سے بڑا چیلنج تھا تحریکِ آزادی کے دوران ابھرے ہوئے عوامی جوش و جذبات کو ایک نیا اور تعمیری رخ دینا اور ان توقعات پر پورا اترنا جو عوام نے اپنے رہنماؤں سے قائم کرلی تھیں۔ اسی سے وابستہ تھا ملک کی سماجی، اقتصادی، سیاسی اور تہذیبی شیرازہ بندی کا چیلنج۔ تقریباً ایک صدی کے برطانوی استحصال کے نتیجے میں ملکی معیشت بری طرح تباہ ہوچکی تھی، قومی وسائل اور پیداواری ذرائع حد درجہ ابتری کی حالت میں تھے اور صنعت و تجارت پر اضمحلال طاری تھا۔ آبادی کا بیشتر حصہ غریبی اور ناخواندگی کی تاریکیوں میں غرق تھا۔ اس صورتِ حال سے ابھرنے کے لیے آزاد ہندستان کے قومی معماروں نے منصوبہ بند ترقی کا راستہ اختیار کیا اور اس میں سب سے زیادہ توجہ معیشت کی تشکیلِ نو پر دی گئی۔ اس کام کے لیے اقتصادیات کے ایسے ماہرین درکار تھے جو معیشت کے نظریاتی اور عملی دونوں پہلوؤں پر گہری نظر رکھتے ہوں اور جنھیں ملک کے مخصوص حالات کا گہرا ادراک بھی حاصل ہو۔ ان ماہرین اقتصادیات میں علی محمد خسرو ایک منفرد مقام رکھتے ہیں جنھوں نے معاشیات کے اصولوں پر اپنی مضبوط گرفت کے ساتھ ساتھ عملی پیچیدگیوں کو جزرسی کے ساتھ حل کرنے کی زبردست صلاحیت کے ذریعے قومی اقتصادی بحالی میں نمایاں کردار ادا کیا۔

لیکن اس خاص شعبۂ مہارت میں بھی خسرو صاحب نے اپنا ایک الگ امتیازی نقش قائم کیا۔ انھوں نے اقتصادیات کے اپنے علم کو محض اعداد و شمار اور علمی اصطلاحات کا ایک خشک مجموعہ نہیں بننے دیا۔ ان کی جمالیاتی حس، تہذیبی نفاست اور سب سے بڑھ کر ان کی انسان دوستی نے ان کی علمی تحریروں میں ایک ایسی دل کشی پیدا کردی جو دل اور دماغ کی یکجائی کے بغیر ممکن نہیں۔ دل اور دماغ کی اس یکجائی نے انھیں ہمارے عہد کے اس آشوبِ آگہی کا شکار ہونے سے محفوظ رکھا جس کی طرف اقبال نے ''عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں'' کہہ کر اشارہ کیا تھا۔

ہم جانتے ہیں کہ اقتصادیات سمیت مختلف سماجی علوم انسانی اور سماجی حقیقت کے قابلِ تجزیہ اور خارجی طور پر قابلِ تصدیق Data پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان میں انسانی باطن کے پراسرار وجدانی محرکات کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔ اسی لیے یہ علوم اکثر و بیشتر معروضیت کی جستجو میں انسان اور سماج کی حقیقی صورت حال کو گرفت میں لانے سے معذور ہوجاتے ہیں۔ مگر خسرو صاحب کے ساتھ معاملہ دیگر تھا۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ایک ایسے خاندان اور ثقافتی ماحول میں پیدا ہوئے جہاں تصوف اور اس کے روحانی اثرات کے سلسلے کئی پشتوں سے چلے آرہے تھے۔ اس ماحول نے خسرو صاحب کے دل و دماغ کو جلا بخشی اور اسے تہذیبی، انسانی اور اخلاقی طور پر درست کردیا اور دل کی اس درستی نے ساری عمر ان کے فکر و عمل کو وسیع تر انسانی محور پر قائم رکھا۔

خسرو صاحب کا شجرہ مشہور صوفی بزرگ خواجہ میراں جی شمس العشاق سے ملتا ہے جنھوں نے 13ویں صدی میں تصوف اور اردو کے فروغ میں بیش بہا خدمات انجام دی تھیں۔ ان کے اہلِ خاندان چشتی اور قادری سلسلوں میں بیعت تھے۔ ان کے پردادا موسیٰ رضا حسینی بیجاپور سے ترکِ وطن کرکے حیدرآباد آئے اور نظام سرکار میں صوبے دار ہوئے۔ ان کے دادا اور والد بھی نظام حکومت میں اعلا عہدوں پر فائز رہے لیکن تصوف سے عملی وابستگی کے سبب ان کا خاندانی ماحول اس رعونت اور انسان بیزاری سے بچا رہا جو اعلا عہدوں اور اہلِ اقتدار کی قربت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس کے برعکس انھیں ایک ایسا ماحول ملا جس میں خود بقول خسرو صاحب: ''اچھے اخلاق و آداب تھے، رکھ رکھاؤ اور آپسی رشتوں کا لحاظ تھا اور ساتھ ہی روزانہ زندگی میں ایک باقاعدگی اور ڈسپلن تھی۔'' (خسرو صاحب سے ایک ملاقات، علی محمد خسرو، خصوصی شمارہ 'کتاب نما')۔ اس ماحول میں انھیں مذہبی رواداری اور بقائے باہم کا اوّلین درس بھی حاصل ہوا جو لاشعوری طور پر ان کی سائکی کا حصہ بن گیا۔ خاندانی ماحول سے حاصل ہونے والے تصوف کے اثرات، مذہبی رواداری اور وسیع المشربی کا عمومی ماحول جو اس وقت ریاست حیدرآباد کی سماجی زندگی کا خاصہ تھا اور خود اپنی مخصوص افتادِ طبع جس کی تشکیل میں اردو اور فارسی شاعری کا گہرا عمل دخل تھا، ان سب کے زیرِ اثر خسرو صاحب کالج

تک آتے آتے بائیں بازو کے سیاسی افکار اور ترقی پسند ادب سے متاثر ہونے لگے۔ مخدوم محی الدین کی شاعری نے ان کے نوخیز ذہن کو خاص طور پر مسحور کیا۔ تصوف اور ترقی پسندی کی مشترک انسان دوستی اور وسیع المشربی کی یہی طاقت تھی جس نے خسرو صاحب کو مجلسِ اتحاد المسلمین کے تحت اس تحریک سے دور رکھا جو حیدرآباد کو اسلامی ریاست بنانا چاہتی تھی۔ خود خسرو صاحب کے بقول: ''اس میں انتہا پسندی حد سے زیادہ آگئی تھی اور رجعت پسندی کوٹ کوٹ کر بھر گئی تھی۔ جو رضا کار گروپ پیدا ہوا وہ دن بہ دن سخت سے سخت تر بنتا گیا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے یہ گروپ بڑا کٹر گروپ بن گیا جس سے مجھے ایک نفرت سی ہوگئی۔ بہرحال سب ملا کر کچھ تو رجعت پسندی اور قدامت پسندی کی مخالفت اور ترقی پسندی کی کشش سے اور بہت کچھ پیغمبرِ اسلام کی عوام پسند، روادارانہ، منصفانہ اور غیر متعصب تعلیم سے متاثر ہو کر میرا رجحان کچھ لبرل ازم اور کچھ سوشلزم کی تائید میں قائم ہوا۔'' (حوالہ سابق)

اس کھلے ذہن، نکھرے ہوئے تہذیبی شعور اور بے پناہ تخلیقی ذہانت کے ساتھ جب خسرو صاحب برطانیہ کی لیڈس یونیورسٹی گئے تو وہاں ان کی صلاحیتوں کو مطالعے، غور وفکر اور تحقیق وتجزیے کے نئے افق میسر آئے۔ اس دوران انھوں نے اپنے مضمون اقتصادیات میں اتنی مہارت پیدا کی کہ وطن واپس آتے ہی انھیں پہلے حیدرآباد میں اور پھر دہلی اسکول آف اکنامکس میں تدریسی فرائض انجام دینے پر مامور ہونا پڑا۔ گویا یہ ادارے پہلے سے ہی ان کے وطن آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ دہلی اسکول آف اکنامکس نے تو انھیں صرف 31 سال کی عمر میں پروفیسر شپ پیش کی جس کے لیے انھوں نے درخواست بھی نہیں دی تھی۔ اس کے بعد سے تادمِ آخر حکومت اور دیگر اداروں اور دنیا بھر کی یونیورسٹیوں نے انھیں کبھی فرصت نہ لینے دی۔ پلاننگ کمیشن کی رکنیت سے لے کر حکومتِ ہند کی مختلف مشاورتی کمیٹیوں کی رکنیت یا سربراہی، مختلف رپورٹوں کی تیاری، مطالعے اور جائزے، اقوامِ متحدہ اور دیگر عالمی فورموں میں حکومت کی نمائندگی، دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں وزٹنگ پروفیسر شپ اور لکچر، مختلف صنعتی اداروں میں مشاورتی خدمات، ہر جگہ اور ہر سطح پر خسرو صاحب کی فطری ذہانت اور درّاکی سُرخ رو رہی۔

تدریس وتحقیق ہو یا حکومت کے زیرِ اہتمام اقتصادی منصوبہ بندی کے عمل میں سرگرم شرکت، جو چیز خسرو صاحب کو دوسروں سے ممتاز کرتی تھی، وہ تھی انسانوں اور انسانی معاملات سے ان کی گہری دلچسپی۔ اسی انسانی سروکار کے سبب اقتصادیات کا علم بھی ان کے لیے انسانوں کو سمجھنے اور انسانی حقیقت سے ہم کلام ہونے کا وسیلہ بن گیا تھا۔ انسانوں سے یہی گہری دلچسپی اور انسانی معاملات کو سمجھنے کی یہی طلب تھی جس نے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے خسرو صاحب کی مدت کار کو حیرت انگیز حد تک رنگا رنگ اور بامعنی بنا دیا تھا۔ اس دوران انھوں نے یونیورسٹی برادری کے مختلف طبقوں کے معاملات میں جس گہری ذاتی وابستگی اور شرکت کا مظاہرہ کیا اور جو جمہوری ماحول قائم کیا، وہ یونیورسٹیوں کے انتظام وانصرام کی تاریخ میں ایک علاحدہ باب کی حیثیت رکھتا ہے۔

خسرو صاحب نے اقتصادیات کے موضوع پر متعدد کتابیں اور مضامین لکھے ہیں مگر ان میں 'اکثریت — اقلیت تعلقات کے اقتصادی قوانین' (Economic Laws of Majority-Minority Relations) عنوان کا مضمون اقتصادی بصیرتوں کی ایک روشن دستاویز ہے جو شاید صرف خسرو صاحب ہی پیش کر سکتے تھے۔ اس مقالے میں کمال معروضیت کے ساتھ ایسی اصول سازی کی گئی ہے جسے دنیا بھر میں کہیں بھی اکثریت اور اقلیت کے اقتصادی تعلقات کی تفہیم کے لیے منطبق کیا جا سکتا ہے۔

خسرو صاحب نے اقتصادیات کے ریگ زار میں جگہ جگہ جو نخلستانی خوش گواریاں پیدا کیں وہ سب ان کے نہایت بالیدہ اور نفیس ولطیف تہذیبی احساسِ جمال کا کرشمہ تھا اور یہ احساسِ جمال وجدانی طور پر ان کی تمام شخصیت گفتار و رفتار، نشست و برخاست اور مزاج وافتادِ طبع میں جاری وساری تھا۔ اس نے انھیں وہ شیریں مقالی، لطفِ بیان، نزاکتِ اطوار، نفاستِ خیال دی تھی جسے دیکھ، سُن اور برت کر ہند اسلامی تہذیب کے اعلا ترین معیاروں کے بارے میں کتابوں میں لکھی ہوئی باتوں پر اعتبار آنے لگتا تھا۔ خسرو صاحب کے چلے جانے سے ہمارا ملک اور ہماری تہذیب اپنے ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک نہایت توانا رابطے سے محروم ہوگئی ہے۔

□□□

Zakir Husain Institute of Islamic Studies,
JMI, New Delhi-110025

جوابات کوئز:

1-الف	2-د	3-ج	4-الف	5-الف	6-د
7-ب	8-د	9-ب	10-ج	11-الف	12-الف
13-ج	14-ب	15-ب	16-د	17-الف	18-د
19-ج	20-الف	21-د	22-الف	23-ج	24-الف
25-ب	26-الف	27-ج	28-ج	29-د	30-ب
31-ج	32-ب	33-الف	34-ج	35-د	36-ج
37-الف	38-الف	39-ج	40-ج	41-د	42-ج
43-الف	44-ب	45-ج	46-ج	47-الف	48-الف
49-الف	50-ب				

احوالِ شخصی

نام: علی محمد خسرو (سید علی محمد الحسینی خسرو)

تاریخ و جائے ولادت: یکم مئی 1925 (حیدرآباد، دکن)

تعلیم: ایم.اے (مدراس) بی.اے (آنرز) اور پی.ایچ.ڈی (لیڈس)

اعزازی اسناد: ایل.ایل.ڈی. (اعزازی) لیڈس یونیورسٹی

ڈی.لٹ. (اعزازی) گلبرگہ یونیورسٹی

ڈی.لٹ. (اعزازی) کلکتہ یونیورسٹی

عہدے اور مناصب: صدر، فیڈریشن آف انڈو جرمن سوسائٹیز، ایس بی آئی میچول فنڈ، چیئرمین، آغاخاں فاؤنڈیشن (ہند) (2001-1986)۔ چیئرمین۔ 11واں فنانس کمیشن (2000-1998) کنسلٹنگ ایڈیٹر، فنانشیل اکسپریس (1998-1994)، ایڈیٹر فنانشیل اکسپریس (1994-1990)، رکن پلاننگ کمیشن، حکومتِ ہند (1984-1982)، فیلو (1970-1958)، ڈائرکٹر (1974-1970) اور چیئرمین (1998-1994)، انسٹی ٹیوٹ آف اکنامکس گروتھ، نئی دہلی، رکن اکنامک ایڈوائزری کونسل آف پرائم منسٹر (1984-1980)، سفیرِ ہند برائے فیڈرل ریپبلک آف جرمنی (1982-1980)، وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (1979-1974) چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (1994-1992)، چیئرمین، ایگریکلچرل کریڈٹ ریویو، ریزروبینک آف انڈیا (1989-1988)، چیئرمین نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک فنانس اینڈ پالیسی، نئی دہلی (1988-1984)، چیئرمین سینٹر فار اکنامک اینڈ سوشل اسٹڈیز، حیدرآباد (1989-1984)، ڈائرکٹر ایئر انڈیا (1994-1992)، ڈائرکٹر، ریزروبینک آف انڈیا (1979-1970) پروفیسر اقتصادیات، دہلی یونیورسٹی (1974-1957)، چیئرمین، کمیٹی آف مانیٹری فیلکس آف پی ایل 480 (1970-1968)، ممبر نیشنل کمیشن آف ایگریکلچر (1974-1970)، صدر انڈین اکنامک ایسوسی ایشن (1993-1992)، صدر انڈین ایگریکلچر اکنامکس کانفرنس (1968)، وزٹنگ پروفیسر، فلیچر اسکول آف لا اینڈ ڈپلومیسی، امریکہ (1966)، فل برائٹ فیلو، امریکہ (1966-1965)، ہمبولٹ فیلو، جرمنی (1988-1987)، لکچرر اقتصادیات، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد (1957-1952) کارپوریٹ وابستگی، چیئرمین جے اینڈ کے انڈسٹریل اینڈ ٹیکنیکل کنسلٹینسی آرگنائزیشن جموں، چیئرمین ڈائرکٹر میکاسٹر فن لیز لمیٹڈ، چیئرمین و ڈائرکٹر میکاسٹر سیکوریٹیز پرائیویٹ لمیٹڈ، چیئرمین ٹرانس ورلڈ لیزنگ لمیٹڈ، حیدرآباد، ڈائرکٹر انڈین اکسپریس نیوز پیپر (بامبے) لمیٹڈ۔

سابق: چیئرمین، ڈائرکٹر کے ایل ہائی ٹیک سلور، پرنٹ لمیٹڈ حیدرآباد۔ ڈائرکٹر ہندستان کاپر لمیٹڈ، ڈائرکٹر رسک کیپٹل اینڈ ٹکنالوجی فنانس کارپوریشن لمیٹڈ، ڈائرکٹر سینڈوز (انڈیا) لمیٹڈ، ڈائرکٹر شیولاک فرٹیلائزرز لمیٹڈ، ڈائرکٹر آتما اسٹیل لمیٹڈ۔

بین الاقوامی ذمے داریاں: رکن ہندستانی وفد برائے UNCADII (1968 کانفرنس آف کلب آف روم، میکسیکو میں وزیرِ اعظم ہند کی نمائندگی کی (1978)- سربراہ ہندستانی وفد پلاننگ کمیشن برائے گوسپلان آف سوویت یونین (1974) اور برائے مشرقی جرمنی (1984)، سربراہ ایکسپرٹ گروپ برائے فیوچر آف انٹرنیشنل مانیٹری اینڈ فنانشیل سسٹم، (تشکیل کردہ از مسز اندرا گاندھی بحیثیت چیئرپرسن ناوابستہ تحریک) (1984) چیئرمین ریویو کمیٹی برائے انٹرنیشنل فوڈ پالیسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، واشنگٹن ڈی سی (1989) آلٹرنیٹ لیڈر، ہندستانی وفد برائے انسانی حقوق کمیشن، جنیوا (1993)، رکن انڈو جرمن کنسلٹیو گروپ، وزارت خارجہ ہند (1992)۔

تصنیفات: پاورٹی آف نیشنز (میکملن، لندن) 1999، 'مانیٹری اینڈ بینکنگ اکنامیٹرکس (نیو ایج پبلیکیشنز) 1996'، انفلشڈ ایجنڈا: انڈیا اینڈ دی ورلڈ (ولے ایسٹرن) 1994، فیجنگ دی انڈین ایکانمی (ہرآنند) 1993، دی انڈین ایکانمی: اسٹیبلٹی اینڈ گروتھ (پراچین پرکاشن) 1979 'اکنامکس آف لینڈ رفارم اینڈ فارم سیکٹر ان انڈیا (میکملن کمپنی آف انڈیا لمیٹڈ)، 1973۔ بفراسٹاک اینڈ اسٹوریج، آف فوڈ گرینز ان انڈیا (ٹاٹا میک گراہل) 1973 مارکیٹنگ ان انڈیا (جان آرمور اور ایس.ایس. جوشی کے ساتھ) (پرینٹس ہال آف انڈیا) این اکنامیٹرک ماڈیل آف بینکنگ ان انڈیا (این. ایس. سدھاتھن کے ساتھ)، بینکنگ کمیشن 1972 دی پرابلم آف کوآپریٹو فارمنگ ان انڈیا (اے.این. اگروال کے ساتھ) ایشیا پبلشنگ ہاؤس 1961'۔ اکنامکس اینڈ سوشل افیکٹس آف جاگیرداری ایبولیشن اینڈ لینڈ رفارم ان حیدرآباد (عثمانیہ یونیورسٹی پریس) 1958

رپورٹ بحیثیت چیئرمین: رپورٹ ایکسپرٹ گروپ آف انٹرنیشنل مانیٹری اینڈ فنانشیل سسٹم (تشکیل کردہ از چیئرپرسن، ناوابستہ تحریک، رپورٹ، ایگری کلچرل ریویو کمیٹی لمیٹڈ) 1989 رپورٹ کمیٹی برائے فنانسنگ آف اسمال اسکیل انڈسٹری، کمیٹی برائے فارورڈ مارکیٹس (حکومتِ ہند)، 1980 رپورٹ، ایکسپرٹ کمیٹی برائے مانیٹری افیکٹس آف پی ایل 480 ٹرانزیکشنز (وزارت مالیات) 1969

بحیثیت رکن: رپورٹ قومی کمیشن برائے زراعت (حکومتِ ہند) 1970 رپورٹ اسٹڈی گروپ آن پروڈکشن (پلاننگ کمیشن) 1975، رپورٹ کمیٹی برائے ویجیز، انکمس اینڈ پرائسیز، حکومت ہند۔

مقالات: پروفیشنل جرنلوں میں تقریباً 30 مقالات، 15 پی ایچ ڈی تھیسس کی نگرانی اور ڈگریاں۔

ایوارڈ: کمانڈرس کراس آف دی آرڈر آف میرٹ، حکومت فیڈرل ری پبلک آف جرمنی۔ 1992

(بشکریہ: ''کتاب نما'' نئی دہلی، علی محمد خسرو نمبر، نومبر 2001)

اختر الواسع/ فرحت احساس

علی محمد خسرو سے گفتگو

فرحت احساس: آپ کے اسکول اور کالج کے دور میں کیا سیاسی اور عام ماحول تھا حیدرآباد کا؟ اس سے آپ کس طرح متاثر ہوئے؟ یہ دور تو ترقی پسندی اور مخدوم کا دور تھا۔

خسرو صاحب: ہمارا خاندان صدیوں سے صوفی منش تھا۔ یہ لوگ رواداری، ہم آہنگی اور بھائی چارے کی مثال تھے۔ ان میں لبرل ازم کی اسپرٹ تھی۔ صوفیا کٹر پن سے بہت دور ہیں اور یہ طرز فکر و عمل ہمارے خاندان میں سینہ بہ سینہ چلا آیا تھا۔ شاید مجھ میں بھی یہ روادارانہ تخیل سرایت کر گیا تھا۔ ہمارے لوگ ریونیو ڈپارٹمنٹ کے عہدیدار تھے، سول سروس کے لوگ تھے۔ یہ فیوڈل ارسٹاکریسی کے لوگ نہیں تھے۔ یعنی جو رنگ فیوڈل بادشاہ کا، امرا کا اور دربار کا تھا وہ دوسرا ہی رنگ تھا، اگر چہ آداب، اخلاق، تہذیب اور تقریر میں یہ رنگ مڈل کلاس اور لوور مڈل کلاس میں سرایت کر جاتا تھا۔ ہمارے لوگ مڈل کلاس ہی میں گنے جائیں گے، ارسٹاکریسی میں نہیں آتے تھے اور فیوڈل ازم گھسا نہیں تھا ہمارے اندر۔ اگر لینڈ لارڈ ہوتے، جاگیردار ہوتے، زمیندار ہوتے تو شاید بات دوسری ہوتی۔ لیکن اس تہذیب سے ہم دور رہے اور ہم پر Libralisation اور Non Feudal Aporoach کا اثر رہا۔ اب طالب علمی کے زمانے میں جو اساتذہ ہمارے رہے، ان کا بھی اثر ہوگا۔ ان میں تو مجھے یاد نہیں آرہا کہ کوئی بائیں بازو کا آدمی ہوا کرتا تھا سوائے ایک میر حسن صاحب کے جو دو سال تک مدرسہ عالیہ میں میرے اردو کے استاد رہے۔ وہ البتہ ترقی پسند آدمی تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی حسن کا ابھی ابھی انتقال ہوا۔ ''سیاست'' میں ایڈیٹر تھے اور صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ ہمارے دوسرے اکثر اساتذہ لبرل لوگ تھے، رواداری اور مساوات کے طرز فکر سے ان کو بیر نہیں تھا۔ اس زمانے میں مخدوم محی الدین کی شاعری کی اٹھان تھی، ان کا بھی اثر ہم پر ہوا اور خود کالج کی تعلیم کے زمانے میں تعلیم کے ذریعے بھی میرا رجحان بائیں بازو کی طرف ہوتا گیا۔ کسی نے مجھے سوشلزم سکھایا نہیں اور کسی سوشلسٹ استاد اور ان کے حلقے میں زیادہ گھسا نہیں۔ کسی نے مجھے پٹی نہیں پڑھائی، صرف ماحول میں رہ کر میرا رجحان اس طرف ہو گیا اور Conservation سے میں دور بھی ہو گیا اور اس کے خلاف بھی رہا۔ مذہب کے تعلق سے میں ہمیشہ ایک لبرل مسلمان ''لکیر کا فقیر'' نہیں اور رسول اللہؐ کی تعلیم کا معتقد رہا کہ وہ رواداری اور مساوات کے سب سے بڑے محرک تھے۔

اختر الواسع: آپ کا تعلق علی گڑھ میں بحیثیت وائس چانسلر طلبہ یونین کے سرپرست کی حیثیت سے بھی رہا اور وہاں جو Trade Unions تھیں، ان سے بھی آپ کے معاملات بحیثیت وائس چانسلر رہے۔ وہ زمانہ علی گڑھ میں کشمکش اور کشاکش کا تھا۔ اس بارے میں بتائیے کہ آپ کا طالب علمی کے دور میں اور بعد کی زندگی میں یونین کا جو تجربہ تھا، اس سے آپ نے وہاں کس طرح فائدہ اٹھایا؟

خسرو صاحب: کئی جگہ میرا تعلق اسٹوڈینٹس یونین یا ٹیچرز ایسوسی ایشن سے رہا۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں، دہلی یونیورسٹی میں اور لیڈز یونیورسٹی میں، میں ان کی انتظامیہ کا ایگزیکیٹیو ممبر رہا۔ ان ایسوسی ایشن اور یونین کے بارے میں تائیدی اور مثبت خیالات لیے میں علی گڑھ پہنچا۔ یہاں دیکھا کہ بڑی بھاری ایسوسی ایشن اور یونین بنی ہیں۔ کلاس فور میں 2400 افراد کی دو یونین۔ کلاس 3 کی 2 یونین ہیں 1200 افراد کی۔ اساتذہ کی 1000 ممبران کی اسٹاف ایسوسی ایشن موجود ہے اور ان کی جو لیڈر شپ ہے، وہ پروفیسران کے ہاتھ میں ہے۔ پروفیسر عرفان حبیب، سی۔ پی۔ ایم۔ کے اور بنرجی صاحب اور کے پی سنگھ صاحب ہندی کے مشہور استاد یہ سب بائیں بازو کے لیڈر تھے۔ شروع میں تو انھوں نے مجھے اپنا مخالف سمجھا کیوں کہ میں انتظامیہ کا آدمی تھا اور وہ اپنے آپ کو ورکنگ کلاس کے افراد سمجھتے تھے۔ ان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ میں ان سے زیادہ ورکنگ کلاس کا حامی تھا اور ان کی طرف سے کام کر چکا تھا۔ خیر میں مسکراتا رہتا جب میٹنگیں ہوتی تھیں۔ ایمرجنسی لگ چکی تھی اور ایسی میٹنگیں ممنوع قرار دے دی گئی تھیں مگر میں نے ہمیشہ ان میٹنگس کو روا رکھا۔ Students Union کبھی میں نے بند نہیں کی۔ اگر چہ سارے ہندستان کی اسٹوڈینٹس یونینز بند ہو گئیں اور ہم کو بھی احکامات آگئے تھے کہ آپ Students Union بند کر دیں۔ ہندستان کے سارے وائس چانسلروں نے اس بات کا فائدہ اٹھا کر یونینز بند کروا دیں اور آرام سے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا کہ صاحب بغیر یونین کے زندگی کا مزہ کیا ہے؟ یونین سے زندگی ہے۔ بہر حال یونینز جاری رہیں۔ الیکشن ممنوع قرار دیے گئے تو

● ماہنامہ ''کتاب نما'' کے خصوصی شمارے میں پروفیسر علی محمد خسرو کا ایک طویل انٹرویو شائع ہوا تھا۔ جس میں خسرو صاحب سے معیشت، ادب، سیاست وغیرہ کے مختلف موضوعات پر گفتگو کی گئی تھی۔ اس انٹرویو کے بعض اہم حصّے قارئین ''اردو دنیا'' کی نذر ہیں۔

میں نے Indirect Election کروادیے، ہر کلاس سے قابل ترین طلبہ لیے گئے اور کچھ پاپولر لیڈر اور کچھ Achievers بھی جن کا اپنے اپنے دائروں میں کام اچھا ہوتا تھا، پڑھنے لکھنے میں، کھیل کود میں اور Extra-Curricular Activity میں۔

اس زمانے میں اعظم خاں جیسے جانے مانے لیڈر اور ایس ایم عارف جیسے جید لوگ وہاں موجود تھے اور مجھے ان سے اتفاق نہیں تھا۔ طلبہ کے کئی لیڈروں کے ساتھ مجھے نرمی گرمی کرنی پڑی۔ اپنے زمانے کے اسٹوڈینٹس یونین کے چاروں پریزیڈینٹس سے میری لڑائی رہی۔ لیکن چاروں مجھ سے مسلسل لڑتے نہیں رہے۔ میری لڑائی ہوتی تھی Issue کے اوپر اور وہ سمجھتے تھے کہ ان کی شخصیت سے میری لڑائی ہے۔ جب ایک Issue جس میں، میں نے ان کی مخالفت کی تھی وہ جیت جاتے یا میں جیت جاتا اور پھر کوئی دوسرا ایشو اگلے آٹھ دن کے بعد آجاتا، تو کیا دیکھتے ہیں کہ وائس چانسلر صاحب انہی لوگوں کی موافقت کر رہے ہیں۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کہاں ایک ہفتے میں مخالفت اور دوسرے میں موافقت۔ میں نے سمجھایا کہ بھائی موافقت یا مخالفت تو ایشو کے اوپر ہے۔ آپ سے کوئی بیر نہیں ہے۔ آخر کار Dialogue کے ذریعے بات سمجھ میں آتی تھی اور یہ چاروں ملتے رہے۔

خیر صاحب علی گڑھ میں، میں نے لوگوں کو بتایا کہ دراصل میں بھی یونین باز آدمی ہوں۔ وہاں جو مسئلے آتے تھے ان میں ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کلاس 4 کی ماہوار تنخواہیں بہت کم تھیں اور ان کو بڑھانا بہت ضروری تھا۔ یہ Issue چلتا رہتا تھا۔ اس وقت کلاس فور کا 196 سے 204 روپے تک کا گریڈ تھا جو کہ بہت ہی کم تھا اور ان لوگوں کی حالت بڑی سقیم تھی۔ دو ہزار دو سو ٹیکنکل اسٹاف تھا اور ایک ہزار سے کچھ زیادہ ٹیچرز تھے اور ہر ایک زمرے میں یہ مسئلہ آتا تھا کہ تنخواہوں کا اسکیل بڑھانا اور دوسری مراعات دینا— میں چاہتا تھا کہ وہ چیزیں ان لوگوں کو مل جائیں مگر ٹریڈ یونین لیڈر اور ایسوسی ایشن والے یہ سمجھتے تھے کہ V.C. ضرور مخالفت کریں گے۔ خیر دو سال تک میں نے لڑائی کی، ایسوسی ایشن سے نہیں بلکہ سینٹرل گورنمنٹ سے۔ میری پوزیشن یہ تھی کہ صرف اگلا گریڈ 210-222 کا تھا بلکہ اس سے بھی ایک گریڈ Jump کر کے میں نے انہیں اگلا اور اونچا گریڈ دلوانا چاہا تو یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی، نہ UGC اور نہ منسٹری کی سمجھ میں آئی، مگر میں نے جم کر بحث کی اور اس لڑائی میں، میں کامیاب رہا۔ UGC کے سامنے مسئلہ گیا، منسٹری آف ایجوکیشن کے سامنے مجھے لے گئے اور آخر میں پارلیمنٹری کمیٹی کے سامنے بھی۔ ہماری فنانس کمیٹی میں پروفیسر شفیع، پروفیسر خلیق احمد نظامی اور رجسٹرار تھے۔ سینٹرل یونیورسٹیز کی تاریخ میں پہلی بار میں نے فنانس کمیٹی میں ووٹنگ کروادی جس میں UGC اور منسٹری کے نمائندے ہار گئے اور ہماری کامیابی رہی۔ آخر ہم نے علی گڑھ کے دو ہزار چار سو کلاس فور اسٹاف کے لیے نئے گریڈ دلوادیے، جو نہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ملے نہ دہلی یونیورسٹی میں، نہ وشو بھارتی میں اور نہ حیدرآباد یونیورسٹی میں، مگر علی گڑھ میں مل گئے جس سے لوگوں کو بڑا اچنبھا ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ تمام سینٹرل یونیورسٹیز کے وائس چانسلروں میں صرف سابق صدر جمہوریہ ہند مسٹر کے۔آر۔ نارائنن نے جو اس زمانے میں JNU کے V.C. تھے، میری تائید کی تھی۔ ہماری ایسوسی ایشن اور یونین کے لیڈر میں کئی پروفیسر صاحبان بھی تھے جو عموماً بڑے قابل لوگ تھے۔ پروفیسر عرفان حبیب کا بائیں بازو سے تعلق تھا، میں ان کا بڑا قائل تھا۔ اسی طرح بائیں بازو کے لیڈر ہندی کے مشہور استاد پروفیسر کے پی سنگھ کا بھی میں قائل رہا۔ ان کے علاوہ انجینئرنگ کے پروفیسر خواجہ شمیم جو بعد میں چھ مہینے تک وائس چانسلر بھی رہے، یونینز کے بارے میں بڑا مثبت رول ادا کرتے تھے۔ ہماری ایسوسی ایشن میں اکثر دو گروپ ہوا کرتے تھے جیسے ٹیکنکل اسٹاف میں دو گروپ اور کلاس فور میں دو گروپ۔ اور ہر ایک یہ خواہش کرتا تھا کہ اس کی مانگ دوسرے کی مانگ سے زیادہ ہو اور جب وہ مان لی جائے تو اس کا نام ہو جائے اور زیادہ ممبران اس کی طرف آجائیں۔ خیر ہمارے دل میں یہ ہوتا تھا کہ بھئی جو بہتر مانگ ہے وہ مل جائے تو اچھا رہے گا لیکن یہ چیز ان کی سمجھ میں آسانی سے آتی نہیں تھی اور وہ مجھے اپنا مخالف ہی سمجھا کرتے تھے، بعد میں کافی ماننے لگے۔ خیر مجھے وہ ماحول یاد آرہا ہے کہ میرے زمانے میں پانچ ہنگر اسٹرائک یعنی بھوک ہڑتالیں ہوئیں۔ مگر میں نے بھوک ہڑتال میں کبھی کوئی Concession نہیں دیا کیونکہ اگر ایک بار بھوک ہڑتال والی مانگ کو مان لیا گیا تو بھوک ہڑتال عام ہو جائے گی۔

بہر حال جناب وہاں میرا Attitude بحیثیت وائس چانسلر کے یہ رہا کہ جتنی جائز مانگیں ہیں یعنی Liberal Thinking کے ساتھ جو جائز ہیں، وہ مان لی جائیں۔ اگر وسائل اجازت دیں اور اس میں ضرورت پڑے تو گورنمنٹ آف انڈیا سے یعنی منسٹری سے اور یو۔جی۔سی۔ سے بحث بھی کرلیں۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ یہ رویہ کامیاب رہا۔

اخترالواسع: اقلیتی کردار کی تحریک کی جدوجہد کا وہ زمانہ تھا اور علی گڑھ والے خاصی بے چینی کا شکار تھے، ان لوگوں نے یہ بھی کہا کہ سڑکوں پر آگئے تھے اور یونیورسٹی کے کام میں خاصا خلل پڑ رہا تھا۔ ان حالات میں آپ وہاں گئے تو آپ کا وہاں کس طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑا اور انہیں آپ نے ہموار کرنے میں جو رول ادا کیا اور اقلیتی کردار کی کامیابی میں آپ کا جو کلیدی رول رہا، اس کے بارے میں بھی کچھ بتائیے؟

خسرو صاحب: علی گڑھ کا جو ایکٹ آف پارلیمنٹ تھا جس کے تحت علی گڑھ کا نام چلتا تھا وہ 1920 کا ایکٹ تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ مسلمانوں نے

اس ادارے کو قائم کیا ہے۔ کئی برس گزر گئے اور یہ ایکٹ چلتا رہا۔

اختر الواسع: 1951 میں تبدیلی ہوئی تھی۔

خسرو صاحب: ہاں ایکٹ میں تبدیلی ہوئی پھر Amendments ہوتے رہے۔ پھر 1972 میں پروفیسر نورالحسن نے جو مرکزی ریاستی وزیر تعلیم بنے تھے، ایک نیا ایکٹ لاگو کردیا۔

اختر الواسع: 1965کے ایکٹ کو Amend کر دیا 1972 میں؟

خسرو صاحب: جی ہاں 1972 میں لیکن جب میرا دور آیا اور میں علی گڑھ پہنچا تو حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ 1972 میں نورالحسن صاحب نے مسز گاندھی، وزیر اعظم کو غلط باور کرا کے جلدی سے ایک نیا Amendment Bill بنوا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دو دن کے اندر دونوں ہاؤسز کے اندر اس کو پاس کروا دیا۔ پہلے تو وزیر اعظم اندرا گاندھی نے سمجھا کہ یہ ٹھیک ہے۔ نورالحسن صاحب تو علی گڑھ کو جانتے ہیں اور بیس سال تک علی گڑھ کے پروفیسر رہ چکے ہیں مگر یہ خیال غلط تھا۔ ایکٹ بدل گیا، سارے ملک میں کنٹرول علی گڑھ یونیورسٹی کے اوپر سے اٹھا لیا گیا۔ یہ تھا اس کا لب لباب۔ میں وائس چانسلر بننے سے پہلے ان چیزوں سے زیادہ واقف نہیں تھا۔ ایک دن اپنے وطن حیدرآباد گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آم بیچنے والا ایک ٹھیلے والا وہاں کھڑا ہے۔ لنگی اور بنیان پہنے ہوئے چار مینار کے آس پاس آم بیچ رہا ہے، تو میں نے بھی اس سے کچھ آم خریدے۔ اس نے مجھ سے پوچھا، صاحب علی گڑھ کے قانون کے بارے میں آپ کیا سمجھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے تو ٹھیک ہی لگتا ہے۔ وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے کہا مجھے آپ کے منہ سے یہ سن کر افسوس ہوا صاحب۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ بات پہنچ گئی تھی آم بیچنے والے تک اور عام مسلمان اس سے واقف ہو چکے تھے کہ علی گڑھ کے ساتھ بڑا انیائے ہوا ہے کہ ایکٹ بدل گیا۔ خیر، جب میں علی گڑھ پہنچا تو میں نے پانچ چھ مہینے حالات کا مطالعہ کیا اور مجھے یقین ہوگیا کہ جو چیز کی گئی تھی، وہ غلط تھی اور دوبارہ ایکٹ کو بدلنا ضروری ہوگیا تھا، چاہے وہی ایکٹ نہ ہو لیکن ایک بہتر ایکٹ بن جانا چاہیے۔ چنانچہ اس معاملے میں اساتذہ اور طلبہ کے ساتھ میری ہمدردی ہوگئی اور طلبہ، اساتذہ اور دوسرے کرمچاری نیز اولڈ بوائز سارے کے سارے میرے ساتھ ایکٹ کو بدلنے کی مہم میں شریک ہوگئے۔ وہاں جو بڑی بڑی میٹنگیں علی گڑھ کیمپس میں ہوتی تھیں، تو میں ان میٹنگوں میں شریک ہوجاتا تھا اور لوگ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ وہاں ایک گروپ تھا جو یہ چاہتا تھا کہ دہلی جا کر دھرنے وغیرہ دیں۔ کئی مہینے کا ایجی ٹیشن پہلے ہو چکا تھا۔ اعظم خاں صاحب طلبہ یونین کے سکریٹری تھے، وہ اور دوسرے لوگ یہ چاہتے تھے کہ دوبارہ ایجی ٹیشن شروع کیا جائے۔ چند اور وہاں کے اہم لیڈر تھے جن میں اختر الواسع، ظفر الدین فیضان، جاوید حبیب اور مشتاق احمد خاں تھے، ان سب سے میری بحث ہوئی اور یہ لوگ مان گئے کہ علی گڑھ کے اس ایکٹ کو ہم ہی کیوں نہ بدل دیں اور بدلے ہوئے ایکٹ کا مسودہ وزیر اعظم کو بھیج دیں اور ان سے خواہش کریں کہ اس نئے ایکٹ کو پارلیمنٹ کے اندر پاس کروا دیا جائے اور نورالحسن والا ایکٹ ہٹا دیا جائے۔ میں نے بھی تقریریں کیں اور ان لوگوں نے بھی، اور یہ Slogan طے ہوا کہ علی گڑھ کا ایکٹ علی گڑھ ہی میں اور علی گڑھ کا مسئلہ علی گڑھ ہی میں طے ہوگا۔ سرچ لائیٹ لگی ہوئی ہے، پانچ ہزار آدمی ہاکی فیلڈ پر بیٹھے ہوئے ہیں اور یہ رائے پاس ہوگئی کہ بہ اتفاق علی گڑھ کا مسئلہ علی گڑھ ہی میں حل ہوگا۔ چنانچہ ایک کمیٹی بنائی گئی جو چالیس آدمیوں کی تھی۔ دس طلبہ، دس اساتذہ، دس انتظامیہ کے لوگ اور کرمچاری اور دس اولڈ بوائز۔ آٹھ بار اس کی بیٹھکیں ہوئیں اور اس میں مشہور لوگ بھی تھے۔ کوئی دہلی سے آتا تھا اور کوئی لکھنؤ سے، اس میں Left کے لوگ بھی تھے، عرفان حبیب صاحب بھی تھے، پروفیسر بینر جی بھی تھے، پروفیسر ریکھی بھی۔ وائس چانسلر کی صدارت تھی۔ سب نے مل کر آٹھ بیٹھکوں میں ایک سال کے اندر ایک مسودہ پاس کیا، بل بنایا اور اسے مسز گاندھی کے پاس بھیج دیا کہ یہ سیکولر بل ہے، بہت اچھا ہے۔ آپ ڈاکٹر نورالحسن کا ایکٹ بدل دیں اور اس نئے بل کو منظور کر کے پارلیمنٹ میں پاس کروا لیں۔ اس سے پہلے کہ مسز گاندھی یہ کر سکتیں، وہ ہٹ گئیں اور وزیر اعظم نہیں رہیں، تو یہ مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ لیکن علی گڑھ میں ہم نے سترہ آدمیوں کا ایک ڈیلی گیشن بنایا جس میں اساتذہ، طلبہ، کرمچاری اور اولڈ بوائز سب موجود تھے، اور ڈیلی گیشن جنتا سرکار کے پاس پہنچ گیا۔ بڑی زبردست بحث اس میٹنگ میں ہوئی جس میں جنتا پارٹی کے چیئرمین چندر شیکھر، مرکزی وزیر تعلیم پرتاپ چندر اور بہوگنا صاحب بھی موجود تھے۔ ان کے علاوہ وزیر قانون شانتی بھوشن، ایس این مشرا صاحب جو بعد میں وزیر خارجہ بنے، وہ بھی موجود تھے۔ خیر ہم نے جو مسودہ بنایا تھا، انھوں نے بغور دیکھا۔ اس کے اہم نکات ان کے سامنے رکھے گئے اور جم کر بحث کی۔ ڈیڑھ گھنٹے کی بحث میں گورنمنٹ کے لوگ مان گئے اور مسٹر چندر نے کہا کہ اب میں اس مسودے کو بل میں تبدیل کردوں گا اور پارلیمنٹ میں لے جاؤں گا۔ ایک ہاؤس میں تو انھوں نے جیسا ہمارا منشا تھا، اس ایکٹ کو پاس کروا لیا لیکن دوسرے ہاؤس میں چونکہ ان کی اکثریت نہیں تھی، پاس نہ کروا سکے۔ چلیے وہ دور ختم ہوا۔ جب مسز گاندھی دوبارہ واپس آگئیں تو میں نے مسز گاندھی کو چٹھی لکھی اور کہا کہ آپ کے پاس جو مسودہ بھیجا گیا تھا، وہ نہایت ہی معقول ہے۔ اس میں مسلمانوں کے لیے بھی ریزرویشن نہیں ہے اور یہ سیکولر چیز ہے — یہ کیوں میں نے کہا؟ اس لیے کہ مجھے پتہ تھا اور میں نے منوا بھی لیا تھا چالیس آدمیوں سے ہماری کمیٹی میں کہ ہمارے پاس 65 فی صد سے زیادہ طلبہ مسلمان ہیں۔ Structural

Ratio ہے وہاں یہ ہر سال آتا ہے۔ کوئی بناتا نہیں ہے۔ بلکہ ہوتا ایسا ہے کہ 75 فیصدی درخواست گزار جو Application کے لیے آتے ہیں، وہ مسلمان ہوتے ہیں سارے ہندستان سے اور 25 فیصدی غیر مسلم۔ لیکن چونکہ مسلمانوں کا تعلیمی معیار دوسروں کی نسبت پست ہے اس لیے 75 فیصد درخواست گزار مسلمانوں میں سے 65 فیصد چنے جاتے ہیں، تو 35 اور 65 فیصد کا Structural Ratio علی گڑھ میں قائم ہے جو سال بھر چلتا رہتا ہے۔ تو جب طلبہ اتنے ہیں اور 80 فیصدی اساتذہ مسلمان ہیں تو کاہے کو ہم اس میں ریزرویشن مسلمانوں کے لیے مانگیں اور دوسروں کی نظر میں یہ یونیورسٹی خواہ مخواہ کیوں بدنام ہو؟ کیوں غیر سیکولر قرار پائے؟ سب لوگوں نے مان لیا۔ چنانچہ یہ مسودہ مسز گاندھی کو دوبارہ بھیجا گیا۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ مسز گاندھی نے دو چار دن کے اندر ہی دونوں ہاؤسز میں اس بل کو پاس کروا دیا۔ اور اس سے بڑی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میرے دل میں یہ سوال بار بار اٹھتا رہتا ہے کہ جب یہ چیز ہم کو مل گئی اور کہہ دیا گیا نئے ایکٹ میں کہ:

"University was established and administered by the Muslims of India" تو پھر ہم نے اس کا کیا فائدہ اٹھایا؟ کون سی کارکردگی بڑھائی؟ آخر اس Minority کیریکٹر کا کیا فائدہ یونیورسٹی کو ہوا؟ میرے پاس کوئی مثبت جواب اس وقت تک نہیں ہے، تعداد ہے کہ بہت بڑھ گئی ہے بجائے تیرہ ہزار طلبہ کے جو میرے زمانے میں تھے اب 252423 ہزار لوگ وہاں پڑھتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ حالیہ زمانے میں ہماری انتظامی قابلیتیں ایسی نہیں ہیں کہ ایک کیمپس یا ایک مربع میل میں ہم پچیس ہزار نوجوانوں کو رکھ سکیں اور بغیر کسی خرابی کے اس کو چلا سکیں۔ بہت ضروری ہے کہ یہاں تعداد کو ذرا تھاما جائے۔ Quantity یقیناً Quality کی دشمن ہے۔ Quantity کو تھام کر کوالٹی کو بڑھایا جائے۔ معیار بہتر بنایا جائے، اب بھی شعبے بہت ہی اچھے ہیں۔ مثلاً تاریخ کا شعبہ، یا انجینیرنگ کے شعبے جن میں پیٹرولیم کا ڈپارٹمنٹ کھل گیا ہے۔ علم کیمیا کا کیمسٹری کا شعبہ، ایسے کئی شعبے ہیں جو بہت اچھے ہیں لیکن پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ جس تیزی سے دنیا میں تبدیلی آرہی ہے اس کے مقابلے میں علی گڑھ کچھ پیچھے رہتا جارہا ہے اور یہ ضروری ہے کہ ایک نیا طریقہ رائج کیا جائے یہاں تعلیم کو ابھارنے کا۔

فرحت احساس: آپ نے آزاد ہندستان میں معاشی ترقی کی رفتار دیکھی ہے۔ منصوبہ سازی میں آپ خود شامل رہے ہیں۔ 1947 سے 2000 تک جمہوری ہندستان نے 52 سال پورے کرلیے ہیں۔ آپ کو کئی وزیراعظموں کے ساتھ کام کرنے کا بھی موقع ملا۔ مثال کے طورپر آپ پنڈت نہرو کے زمانے میں منصوبہ بندی اور Cooperative کی پالیسی بنانے میں شامل رہے۔ اندرا گاندھی کے دور میں آپ اکنامک ایڈوائزری کونسل کے ممبر رہے اور پلاننگ کمیشن کے بھی ممبر رہے۔ خارجہ پالیسی کے تعلق سے آپ جرمنی میں ہندستان کے سفیر بھی رہے۔ ہندستان کی معاشی انھان یا گراوٹ پر آپ کس طرح نظر ڈالتے ہیں؟ کیونکہ یہ آپ کا خاص میدان ہے۔

خسرو صاحب: کسی نے ہندستان کے بارے میں کہا ہے کہ:

"Whatever statement you make about India, the opposite of that is also true." اگر گنتی کرنا چاہیں اور فہرست بنانا چاہیں تو جو ترقی اور جو بہتر تبدیلیاں ہوئیں ان کی ایک لمبی فہرست بنتی ہے۔ بڑے بڑے کام بھی ہوئے ہیں۔ پڑھ لکھ سکنے والی آبادی کا تناسب یعنی شرح خواندگی Literacy Rate کہاں 17 فیصد 1951 میں اور کہاں 60 فیصد 2000 میں۔ یہ تو ایک مثال کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ اگر دیکھا جائے تو 1951 میں 360 ملین آبادی کا 17 فیصد پڑھ لکھ سکتا تھا یعنی 70 ملین سے کم تعداد خواندگی کی تھی تو اب ایک ہزار ملین کا ساٹھ فیصد یعنی 600 ملین لوگ خواندہ ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ 50 ملین یعنی پچاس کروڑ سے زیادہ آبادی Literate ہوگئی، یہ تعداد یورپ کی ساری آبادی یا امریکہ کی ساری آبادی سے ڈیڑھ گنا زیادہ ہے۔ مانا کہ ہمارے ہاں خواندگی کا معیار بہت پست ہے۔ لوگ ٹُد بُد جانتے ہیں لکھنا پڑھنا۔ ان پچاس برسوں میں جس طرح 500 ملین آدمی Illiteracy سے Literacy کی طرف آئے اسی طرح صحت عامہ یعنی ہیلتھ میں بھی جہاں تک اعداد کا تعلق ہے کافی مثبت تبدیلیاں ہوئیں اور کافی ترقی بھی۔ تعلیم ہو یا Literacy یا صحت عامہ ہو یا زندگی کے اور شعبے ہوں، کوالٹی پیچھے رہ گئی یعنی کارکردگی اور معاشی پیداوار گھٹ گئی اور صرف آنکڑے بڑھے۔ میرا خیال ہے کہ کارکردگی کی طرف توجہ کم ہوئی۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ کنٹرول سسٹم جو یہاں لگا اور جو شروع میں ضروری تھا، وہ بڑھتے بڑھتے ساری معیشت اور سارے سماج پر چھا گیا جس کے خراب اثرات ہوئے، تعلیم پر، صحت پر اور Infrastructure کے بننے پر۔ یہ سب شعبے نوکر شاہی کے ذریعے روبہ عمل لائے گئے، یعنی بیوروکریسی کی طرف سے ان کا Implementation ہوا۔ پرائیویٹ سیکٹر کا، این جی او سیکٹر کا اور عوام کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ بیوروکریسی اور ایڈمنسٹریشن ہی ہر چیز کرتا ہے۔ شروع شروع میں اس کی اچھائیاں بھی سامنے آئیں۔ اس کا فائدہ بھی ملا۔ Infrastructure بننے لگا، بجلی، پانی، آبپاشی، کھاد، بیج، لیباریٹریز بننے لگیں، آئی آئی ٹی قائم ہوئے۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ قائم ہوئے، فوج کا معیار بڑھا اور Civil Life کا معیار بڑھا۔ کروڑوں کی تعداد میں طلبہ کے داخلے ہونے لگے جو پہلے صرف لاکھوں میں تھے۔ مگر یہ

صرف تعداد کی بات ہے۔ مانا کہ کہیں کہیں معیار بھی اچھے بنے ہیں جیسے آئی آئی ٹی اور آئی آئی ایم کے معیار۔ یہی طلبہ جب پاس ہو کر امریکہ جاتے ہیں یا انگلینڈ یا یورپ جاتے ہیں تو اچھے اچھوں کے ناک کان کاٹ لیتے ہیں۔ غرض معیاری لوگ بھی موجود ہیں مگر ان کی بہت کم تعداد ہے۔ عام طور پر معیار پست ہے۔ پانچ منٹ آپ بات کرلیں یا ان کا کام دیکھ لیں تو معلوم ہوا کہ کچھ بھی نہیں۔ بہر حال اس ملک میں کوالٹی کی ناکامی ہے اور Quantity کی کامیابی ہے۔ دوسرے جو اہم مسئلے تھے سیکولرزم وغیرہ کے، ان کے اندر میں سمجھتا ہوں دھوکے بازی کا بھی کام رہا۔ میں کہتا ہوں ہندستانی سیکولرزم کے بارے میں کہ یہ کاغذی سیکولرزم زیادہ رہا، اصلی سیکولرازم بہت کم۔ جس کو انگریزی میں کہہ سکتے ہیں کہ Dejure Secularism زیادہ اور Defacto Secularism کم۔ انصاف کا تقاضا پورا نہیں ہوا اور وہ جو مختلف Communities یہاں ہیں، ان کو ان کے حقوق نہیں ملے۔ ان کے Constitutional Rights ان کو نہیں ملے، بس تعصب کافی رہا۔ خیر یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ کئی دائرے ایسے ہیں کہ جن کے اندر تعصب کا زیادہ دخل نہیں۔ مثلاً یو پی ایس سی کے سلیکشن میں۔ یونین پبلک سروس کمیشن میں، اور دوسری Selection Committies میں بھی، Academic دائروں کے سلیکشن کمیٹیوں میں بھی میں نے دیکھا کہ ان مواقع پر جہاں سب مل کر بیٹھتے ہیں وہاں تعصب کو چلانا آسان نہیں ہے۔ ایک آدھ آدمی شاید نمبر کاٹ لے اور اپنے کسی چہیتے کو آگے بڑھائے مگر وہ دوسروں پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ ہاں کوئی چٹھی ڈھکی لکھے گا۔ ایسا ہوتا تھا بعض جگہ ہم نے دیکھا ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ بھی چٹھی دوڑا رہے ہیں، اپنے ایک دوست کو جو سلیکشن کمیٹی میں پروفیسر بن کر آرہا ہے۔ اس کی رائے کو اپنی طرف کرنا ہوسکتا ہے۔ لیکن عام طور پر میں نے دیکھا کہ اس میں بہت زیادہ تعصب نہیں آسکتا۔ دوسری سب سے اہم بات یہ کہ جو درخواست گزار آتے ہیں ان میں تناسب دیکھیے تو اگر کل آبادی میں مسلمان مثلاً گیارہ یا بارہ فیصد ہیں تو مسلمان درخواست گزار کیوں 11 فیصد نہیں آتے، کیوں تین فیصد آتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ قابلیتیں نہیں ہیں۔ جب اشتہار نکلتا ہے کہ فلاں پوسٹ کے لیے سلیکشن ہورہے ہیں، فلاں چیز میں ملازمتیں دی جارہی ہیں اور اس میں مثلاً ایم اے سوشیولوجی سیکنڈ ڈویژن کی شرط ہے تو اس معیار پر 12,11 فیصد تو کجا 7 فیصد امیدوار بھی نہیں آتے۔ اس لیے کہ اس تناسب میں پڑھے لکھے لوگ نہیں ہیں جو درخواست گزار ہوں۔ اس لیے اس کی باری بھی نہیں آتی کہ درخواست گزار مناسب تعداد میں آئیں اور ان کے ساتھ تعصب کے ساتھ فیصلہ ہو۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ عام طور پر اقلیتوں کا پیچھے رہ جانا خاص طور پر مسلم Minority کا قابلیت کی کمی کی وجہ سے ہے۔

فرحت احساس: اس سلسلے میں ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ ہمارے یہاں کوٹہ پرمٹ راج بہت چلتا ہے۔ کوٹہ پرمٹ بانٹے جاتے ہیں کہ آپ کی انڈسٹری ہے تو آپ سفارش لے آئیے، جوڑ توڑ کر لیجیے۔ سروسز میں آنا ہے پاکسی اور شعبے میں تو کنٹرول اور رشوت بازی ماحول میں مسلمانوں کا جو عمل دخل ہوسکتا تھا، وہ نہیں ہوتا۔ معیشت میں ان کا حصّہ اجارہ داری کے چلن کی وجہ سے بہت کم ہوجاتا ہے۔ کیاآپ سمجھتے ہیں کہ جو نئی تبدیلی آئی ہے Economic Liberalism اس میں یہ صورتِ حال کچھ بدلی ہے اور نئے امکانات پیدا ہوئے ہیں یا نہیں؟

خسرو صاحب: اس میں کوئی شک نہیں، جیسا میں نے کہا کہ 1951 سے 1965 تک کے پندرہ سال ایسے گزرے کہ افسر شاہی بیوروکریسی نے جو کام کیے اور نئے ڈھرّے پر اس ملک کو ڈالا، معاشی ترقی کے میدان میں وہ بڑا اچھا عمل تھا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ اس سسٹم میں ایک سختی آگئی اور بیوروکریسی زیادہ مضبوط ہوگئی۔ اس کے بعد وہ جو چاہتی تھی کرلیتی تھی۔

اخترالواسع: قطع کلامی ہوگا کہ اندراگاندھی کے زمانے میں یہ صورت حال جو کوٹہ پرمٹ کی تھی اس نقطے تک پہنچ گئی تھی کہ Productivity پر اس کا منفی اثر پڑا تھا۔

خسرو صاحب: دیکھیے تو بات یہی ہے ایک دور ایسا آگیا جو 1965 سے 1990 تک چلتا رہا اور اب بھی چل رہا ہے۔ اس میں زیادہ نہیں بلکہ تھوڑی تبدیلی آئی ہے Liberalisation کی وجہ سے مگر یہ جو چالیس سال گزرے ہیں نوکر شاہی کے اندھا دھند عمل دخل کے اور ہر دائرے میں کوٹہ پرمٹ اور کنٹرول کے۔ یہ ساری کی ساری چیزیں بیوروکریسی کے فیصلے سے ہوتی تھیں۔ کوئی اس کے پیچھے بنیادی معاشی اصول نہیں ہوا کرتا تھا۔ نتیجتاً یہ ہوا کہ بڑی غلطیاں ہوگئیں پالیسی میں Infrastructure جتنا بننا تھا بن نہ سکا اور پیچھے رہ گیا۔ اس صورتِ حال سے دوسری جو معاشی ترقیاں یا سماجی ترقیاں تھیں مثلاً تعلیم کی، صحتِ عامہ کی یہ سب رک گئیں اور ملک پیچھے رہ گیا۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ Infrastructure کی بہت بڑی کمی ہے۔ بجلی، پانی، تیل، پیٹرول اور کھاد کی۔ ہاں غذا کے معاملے میں کچھ کامیابیاں ہوئی ہیں مگر اس میں بھی، میں یہ کہوں گا کہ کروڑوں لوگ اب بھی ایسے ہیں جن کو اتنی غذا نہیں مل رہی ہے اور Calories نہیں مل رہی ہیں جتنی ملنی چاہیے۔ ہندستانی مسلمانوں کے معاشی مسائل کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گا۔ یہ بات صاف ہے کہ مسلمانوں میں عام طور پر اس ملک میں روزگار کی کمی ہے۔ بیروزگاری بھی ہے اور کم روزگاری بھی۔ اس کی دو وجوہات بتائی جاتی ہیں، ایک تعصب یعنی Employers یعنی آجر چاہے سرکاری آجر ہوں یا غیر سرکاری، ان میں تعصب ہے اور مسلمانوں کو کم ملازمت دی جاتی ہے۔ اور دوسرا یہ کہ قابلیت کی، لیاقت کی کمی ہے اس لیے امتحان میں وہ پورے نہیں اترتے اور پیچھے رہ جاتے ہیں۔ لیکن اگر غور کیا جائے کہ کیا تعصب کی

وجہ سے لوگ پٹ رہے ہیں یا قابلیت کی کمی کی وجہ سے تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ بڑا فیکٹر جو ہے وہ قابلیت کی کمی ہے اور چھوٹا فیکٹر تعصب ہے۔ قابلیت کی کمی اس وجہ سے بھی ہے کہ مسلمان نوجوان تعلیم اور ٹریننگ کے میدان میں زیادہ آنہ سکے اور بہت سے کم ٹریننگ لیے ہوئے اور کم تعلیم پائے ہوئے لوگ موجود ہیں۔ اس لیے بھی ہے کہ اگرچہ مسلمانوں میں بہت سے کاریگر، کارخندار، اور تجارتی قسم کے لوگ ایک طرح کی ٹریننگ پائے ہوئے ہیں لیکن ان کا ہنر صرف پرانی صنعتوں میں ہے مثلاً کمخواب اور منقش بنانا، کپڑے کا بُننا، یا چمڑے کی صنعت وغیرہ لیکن نئی ٹیکنالوجی میں جو بڑے زور کے ساتھ آ رہی ہے اور دیکھتے دیکھتے پندرہ بیس سال کے اندر بازار اور معیشت پر چھا گئی ہے مثلاً کمپیوٹر ٹیکنالوجی، Information ٹیکنالوجی یا تعلیمات کے نئے طریقے یا Biotechnology یا چارٹرڈ اکاؤنٹس یا بزنس ایڈمنسٹریشن یا ایسی بہت سی چیزیں ہیں جن میں مسلمان نوجوان کم آ رہا ہے اور اس کی وجہ بھی ہمت کی، محنت کی، ٹریننگ کی اور قابلیت کی کمی ہے۔ اس لیے اگر کچھ کرنا ہے تو جو لوگ صاحب ثروت ہیں، ہمت والے ہیں اور زمانے کے رجحان کو سمجھتے ہیں ان کا یہ کام ہے کہ تعلیم و تربیت کے ادارے قائم کریں۔ ادارہ سازی شرط اوّل ہے اور جب ادارے ہوں تو ان میں بازار اور حالات کے حساب سے کئی شعبوں کی تعلیم اور تربیت کا انتظام کیا جائے۔ ہر طرح کی ٹریننگ فنون کی، سائنس کی، کمپیوٹرز کی، ٹیکنالوجی کی، انفارمیشن ٹیکنالوجی کی، مینجمنٹ اور بزنس ایڈمنسٹریشن کی اور دیگر نئے شعبوں کی، ان تمام شعبوں کی ٹریننگ جن کے بازار گرم ہیں۔ شرط اوّل میری رائے میں ادارہ سازی ہے۔ شرط دوم بازار کا رجحان دیکھتے ہوئے جہاں جہاں گرم بازاری ہے، جہاں مانگ زیادہ ہے ان دائروں میں داخلے لینا اور انھی مضامین کی ٹریننگ لینا ضروری ہے۔ تیسرے اردو والوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ہندی، انگریزی یا علاقائی زبان پر اچھا قابو حاصل کریں کیوں کہ اکثر انٹرویو یا تو انگریزی میں ہوتے ہیں یا ہندی یا علاقائی زبانوں میں۔ بہرحال لب لباب یہ نکلا کہ ادارہ سازی، ٹریننگ کے انتظامات اور بازار کے رجحان کو دیکھتے ہوئے تعلیم اور ٹریننگ حاصل کر کے مقابلوں میں شرکت کرنا اور پھر انگریزی ہندی یا علاقائی زبان اور اردو تینوں زبانوں پر اچھا قابو حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔

آخر میں اردو زبان کے تعلق سے ایک دو باتیں کہنا چاہوں گا۔ اس میں رونے دھونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے کئی سال پہلے ہندستان کا ایک نقشہ تیار کروایا اور اس میں سرکاری مردم شماری کے جو آنکڑے تھے، ان کا استعمال کر کے لسانی یعنی زبانوں کے اعداد و شمار کو جب دیکھا اور سوال اٹھایا کہ ہندستان کی ہر ریاست میں پہلے نمبر پر کون سی زبان بولی جاتی ہے، دوسرے نمبر پر کون سی، تیسرے نمبر پر کونسی اور چوتھے نمبر پر کونسی زبان ہے؟ حساب لگایا گیا اور ملک کے نقشے پر ہر ریاست میں یہ اعداد لکھ دیے گئے۔ جب دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ ہندستان کی جو بڑی زبانیں ہیں، ان میں اس وقت جو سترہ بڑی ریاستیں تھیں اور آج بھی سترہ ہی ریاستیں ہیں، ان میں 15 ریاستوں میں ہندی اول، دوم، سوم، چہارم درجے پر بولی جاتی ہے اور اس کے بعد جو اور بڑی زبانیں ہندستان کی ہیں، مثلاً بنگالی، مراٹھی، پنجابی، تامل، کنڑ، تلگو، ملیالم، یہ زبانیں صرف چار یا پانچ ریاستوں میں بولی جاتی ہیں۔ ایک تو اس ریاست میں جہاں سے وہ زبانیں چلی ہیں اور پھر آس پاس کی ریاستوں میں مگر چار یا پانچ سے زیادہ ریاستوں میں یہ زبانیں نہیں بولی جاتیں۔ پہلے، دوسرے، تیسرے، یا چوتھے نمبر پر۔ اب اردو کی باری آتی ہے تو یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ سترہ ریاستوں میں سے اردو چودہ ریاستوں میں پہلے نمبر پر تو کہیں نہیں لیکن دوسرے اور تیسرے نمبر اور چوتھے نمبر پر بولی جاتی ہے۔ اس کے بولنے والے ہندستان کے ہر حصے میں کروڑوں کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اول نمبر پر یہ زبان کہیں نہیں ہے۔ کشمیر میں کشمیری ہے، اردو نہیں ہے۔ لیکن دوسرے، تیسرے اور چوتھے نمبر پر یہ زبان عام طور سے بولی جا رہی ہے اور بڑی تعداد میں بولی جا رہی ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ ہندی کے بعد اردو ہندستان کی اہم ترین زبان ہے اور اس کے ساتھ جو انصاف ہونا چاہیے، وہ نہیں ہو رہا ہے۔ خیر، زبان، اپنا انصاف آپ کروا رہی ہے اور ایک طرح سے اس کا بول بالا ہے گو اس کو دوسرے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ کہیں وہ ہندی کہی جاتی ہے کہیں وہ ہندستانی کہی جاتی ہے لیکن وہ ہے اردو۔ عام بول چال جو اس ملک میں ہو رہی ہے وہ اسی اردو۔ ہندی۔ ہندستانی میں ہو رہی ہے۔ یہ زبان سارے ہندستان میں پھیلی ہوئی ہے۔ ضروری ہے کہ اس کی بقا اور مضبوطی کا سامان کیا جائے اور اس کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ کئی طریقے اس کے نکالے جا سکتے ہیں۔ اردو کے مشہور شعرا کا جو کلام چھپا ہے وہ بڑی حد تک دیوناگری میں منتقل ہو چکا ہے اور لوگ بڑی تعداد میں اس کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اردو غزل اب ہندی میں بھی آ گئی اور ہندی پر اردو کا کافی اثر ہو رہا ہے۔ محاوروں کے استعمال میں، Idioms کے استعمال میں، الفاظ کے استعمال میں اردو زبان اثر انداز ہوتی جا رہی ہے۔ مانا کہ اس کا جو رسمِ خط یعنی اسکرپٹ ہے، اس کے پڑھنے والے اب اتنی زیادہ تعداد میں نہیں رہے لیکن پھر بھی کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ بہرحال رسمِ خط کے پڑھنے والے تو کم ہوتے جا رہے ہیں مگر زبان اپنی جگہ باقی ہے، مضبوطی اس میں آ رہی ہے، شعر و ادب اس میں جاری ہے۔ اردو، کلچر کی زبان ہے اور وہ زبان ہے جو دوسروں کو مستفیض کرتی رہے گی اور اپنے آپ کو بھی مضبوط کرتی رہے گی۔

("کتاب نما" نئی دہلی، خصوصی شمارہ علی محمد خسرو نمبر، نومبر 2001)

ترتیب: فیروز عالم

خراجِ عقیدت

● **ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام**

صدر جمہوریہ ہند

''ڈاکٹر خسرو کی موت میں ہم نے نہ صرف ایک ممتاز ماہرِ معاشیات، بلکہ ایک ایسی ہشت پہلو شخصیت کو کھو دیا ہے جس نے کئی حیثیتوں سے ملک و قوم کی خدمت انجام دی۔''

● **کے آر نارائنن**

سابق صدر جمہوریہ ہند

''ملک اپنے ایک اہم خدمت گار سے محروم ہو گیا۔ مجھے وہ منظر یاد آرہا ہے، جب ماضی قریب میں ان کی کتاب ''پاورٹی آف نیشن'' (Poverty of Nation) کی رسمِ اجرا میرے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی تھی۔''

● **وی. پی. سنگھ**

سابق وزیرِ اعظم

''ایک اچھا انسان اور ملک کا خیرخواہ ہم سے دور چلا گیا۔''

● **سونیا گاندھی**

صدر کانگریس پارٹی

''خسرو صاحب کی وفات سے ملک ایک سرکردہ ماہرِ اقتصادیات، ایک لائق منتظم، ممتاز مدبر، مالی امور کے ماہر اور ایک بیدار مغز شخصیت سے محروم ہوگیا۔ وہ سیکولر اقدار میں پختہ یقین رکھنے والے ایسے دانشور تھے، جن کی کمی ہمیشہ محسوس کی جاتی رہے گی۔''

● **مفتی محمد سعید**

وزیرِ اعلا، جموں اور کشمیر

''ڈاکٹر خسرو کی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ جس شعبے میں بھی انھوں نے کام کیا، ایک امتیازی شان کے ساتھ ملک کی خدمت کی۔ چاہے وہ سفارت کاری ہو، تعلیم کا شعبہ ہو، صحافت یا پلاننگ کا۔ ڈاکٹر خسرو جرمنی میں ہندستان کے سفیر رہے۔ گیارھویں مالیاتی کمیشن کے چیئرمین بنائے گئے، پلاننگ کمیشن کے ممبر ہوئے اور ''فنانشل ایکسپریس'' کے ایڈیٹر کا کام بھی کیا۔ ڈاکٹر خسرو نے اپنی ذہانت اور مزاج کی سادگی سے سب کو گرویدہ کیا۔

● **منموہن سنگھ**

ممبر پارلیمنٹ

''ہم ایک دانشور، اسکالر اور ایک کامل انسان سے محروم ہوگئے۔ آنجہانی اندرا گاندھی کے زمانے میں جب ملک اقتصادی بحران سے دوچار ہوا تو ان کے کئی اصلاحی پہلوؤں سے ملک کو تقویت ملی۔''

● **سید شہاب الدین**

صدر، آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت

''وہ ملک کے عظیم سپوتوں میں سے ایک تھے۔''

● **کلدیپ نیئر**

سینئر جرنلسٹ

''میں نے انھیں عملی طور پر مشترکہ کلچر اور گنگا جمنی تہذیب کی نمائندہ شخصیت پایا۔''

● **سید شاہد مہدی**

وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ

''علی محمد خسرو کی وفات ہندستان کی عصری دانش وارانہ روایت، تعلیمی جدوجہد اور سب سے بڑھ کر ہند اسلامی اور اردو تہذیب کا بہت بڑا نقصان ہے۔ وہ معدودے چند ہندستانی مسلمانوں کے ایک نہایت روشن نمائندہ تھے۔ مرحوم کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے اپنی شخصیت کو جدید علوم کی تابناکی کے ساتھ ہند اسلامی تہذیب کے حسن اور نفاستگی کی آمیزش سے سحرانگیز بنا لیا تھا اور ہندستانی مسلمانوں کے تعلیمی اور اقتصادی فروغ کی جدوجہد میں بھی نمایاں حصہ لیا تھا۔ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ان کی خدمات ناقابلِ فراموش رہیں گی۔ بڑوں سے ادب کے ساتھ ساتھ چھوٹوں سے ادب اور شفقت کا طریقہ میں نے انھی سے سیکھا۔ ان کی گفتگو اشعار و غزل سے خالی نہ ہوتی تھی۔''

● **نسیم احمد**

وائس چانسلر، اے.ایم.یو علی گڑھ

''پروفیسر خسرو کی شخصیت ایک تناور درخت کی سی تھی۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور ان کو زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی۔ وہ ہر موضوع پر عالمانہ تقریر کرتے تھے۔ آج خسرو صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کی علمی وراثت ہمیشہ باقی رہے گی۔''

● **حامد انصاری**

سابق وائس چانسلر، اے.ایم.یو علی گڑھ

''ان کی ہمہ گیر شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔''

● **مولانا سید اسعد مدنی**

صدر جمعیۃ العلماء ہند

"ملک ایک اچھے، باوضع، ملنسار اور اچھی روایتوں و قدروں کے حامل انسان سے محروم ہوگیا۔ ایسی خوبیوں کے افراد ملک میں انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔"

● **شاہد صدیقی**

ایڈیٹر "نئی دنیا"، "عوام"

"پروفیسر خسرو کی موت نہ صرف ملک بلکہ مسلمانانِ ہند کے لیے بھی ایک نقصانِ عظیم ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے سرسید کی تہذیب و روایت کے علمبردار رہے اعلا تعلیم یافتہ مسلمان ہونے کے باوجود علی محمد خسرو مشرقی تہذیب کے امین تھے۔ آزادی کے بعد جن افراد نے مسلمانوں کے سماجی، معاشی، تعلیمی میدان کو سنوارنے میں مثبت کردار ادا کیا، ان میں علی محمد خسرو کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ اردو کے دلدادہ علی محمد خسرو نے اپنی مصروفیات کے باوجود اردو سے وابستگی رکھی اور اس کی آبیاری کرتے رہے۔"

● **رفعت سروش**

ممتاز شاعر اور ادیب

"علی محمد خسرو کا بے وقت ہمارے درمیان سے اٹھ جانا ملک و قوم کا ایک عظیم نقصان ہے۔ معاشی پالیسیاں ترتیب دیتے وقت، علم و تعلیم کو سائنٹفک انداز سے فروغ دیتے وقت، ثقافتی اور ادبی جلسوں اور سیمناروں میں خوشگوار اور متوازن ماحول پیدا کرتے وقت ان کی کمی محسوس کی جائے گی۔ احباب کی محفلوں میں ان کی موجودگی نئی زندگی پیدا کرتی تھی اور گھر میں وہ زندہ دلی اور خوش مذاقی کا استعارہ تھے۔"

● **پروفیسر صادق**

صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی

"بیسویں صدی کے آخری عشرے میں ملک میں جو نامور ہستیاں ابھریں، ان میں پروفیسر خسرو کی شخصیت نمایاں تھی۔ ملک اور قوم کی ترقی اور معاشی استحکام عطا کرنے میں ان کے کارہائے نمایاں ناقابلِ فراموش ہیں۔ ہر چند کہ مرحوم کا اختصاصی میدان معاشیات تھا لیکن وہ اردو زبان و ادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور اردو کے فروغ کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ پروفیسر خسرو قوم کی ترقی اور خوش حالی کے خواہاں تھے۔"

● **پروفیسر عتیق اللہ**

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی

"علی محمد خسرو نے ہندستان کے معاشی و اقتصادی حالات کو بہتر بنانے اور بیروزگاری کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے نئے منصوبوں سے ملک کو ایک نئی سمت عطا کی ہے جو یقیناً تاریخی ہے۔"

● **پروفیسر محمد شفیع**

سابق پرو چانسلر، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

"پروفیسر خسرو اے۔ ایم۔ یو۔ کے طلبہ سے گہری محبت کرتے تھے اور نازک حالات میں بھی گفتگو کے ذریعے بڑے سے بڑے مسئلے کو حل کرنے میں انھیں ملکہ حاصل تھا۔"

● **پروفیسر حمیدہ احمد**

شعبۂ نفسیات، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

"وہ ایک ممتاز دانشور ہی نہیں تھے بلکہ ایک مکمل انسان تھے۔ وہ بہت وضع دار انسان تھے اور یونیورسٹی برادری کے ہر شخص سے ان کا ایک تعلق رہتا تھا۔"

● **ناصر کمال**

رجسٹرار، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

"ستمبر 1974 سے ستمبر 1979 تک وہ اے۔ ایم۔ یو۔ کے وائس چانسلر رہے اور ان کی وائس چانسلر شپ کے دوران یونیورسٹی نے ہر میدان میں خاطر خواہ ترقی کی۔ وہ ایک ممتاز دانشور، ماہرِ تعلیم اور اعلا منتظم تھے۔ انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں، انھیں ہندستانی سماج میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔"

● **ڈاکٹر علی جاوید**

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی

"پروفیسر خسرو نے ملک کی معیشت کو جو استحکام عطا کیا ہے اس سے لاکھوں انسانوں کی بدحالی اور تنگ دستی دور ہوئی ہے۔"

● **ڈاکٹر ارتضیٰ کریم**

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی

"پروفیسر خسرو ایک نیک طینت انسان تھے۔"

● **عبدالرب کریمی**

سکریٹری، یونیورسل پیس فاؤنڈیشن، نئی دہلی

"خسرو صاحب اپنی اعلاظرفی، بلند نظری، روشن ضمیری اور علمی قابلیتوں کے سبب پوری دنیا میں شہرت رکھتے تھے۔ میانہ روی، حسنِ اخلاق اور فکری اعتدال کی بنا پر وہ ملی قیادت میں قد آور شخصیت کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔"

● **مرغوب حیدر عابدی**

سکریٹری اردو اکادمی، دہلی

"پروفیسر خسرو نے جہاں بحیثیتِ وائس چانسلر اور چانسلر مسلم یونیورسٹی کی خدمات انجام دیں، وہیں ماہرِ معاشیات کی حیثیت سے ملک کے اقتصادی ڈھانچے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ غالب کی حویلی خالی کروانے میں آپ کی غیر معمولی دلچسپی کا ذکر بھی کیا گیا۔"

(بشکریہ: "قومی آواز" اور "راشٹریہ سہارا"، نئی دہلی 28,27,20 اگست 03)

تحریر: عبدالرحمان مومن
ترجمہ: سہیل احمد فاروقی

معاصر ہندستان میں اردو کی حیثیت: امکانات، خطرات اور رکاوٹیں

برِّصغیر ہندو پاک اور پوری دنیا میں جنوب ایشیائی منتشرہ میں اردو کی اہمیت اور انفرادیت کے بیان میں غلو کی چنداں ضرورت نہیں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ اردو نہ صرف ہندستان کے دلکش لسانی منظرنامے کے ایک حصے کی تشکیل کرتی ہے بلکہ یہ اس کے مخلوط تہذیبی ورثے کی مظہر بھی ہے۔ یہ ہندستان کی تہذیبی اختلاط کے عمل کی علامت اور اس کی آئینہ دار ہے اور یہی اختلاط ہندستانی تہذیب کی امتیازی شان بھی ہے۔ دوسرے یہ کہ اردو نہ صرف ہندستانی برِّصغیر میں لاکھوں افراد کی زبان ہے بلکہ یورپ، شمالی امریکہ، آسٹریلیا، افریقہ اور ایشیا کے جنوب ایشیائی منتشراتی معاشروں میں بھی بولی جاتی ہے۔ نیز اس زبان میں رسائل، اخبارات اور کتابیں پانچ برِّاعظموں سے شائع ہوتی ہیں۔ درجنوں ممالک میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن پروگرام اردو میں نشر ہوتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ ہندستان کی بیشتر زبانوں کے برخلاف اردو کسی ایک مخصوص خطے یا نسلی گروہ تک محدود نہیں ہے۔ یہ ملک کے کونے کونے میں وسیع پیمانے پر سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ چند سال پہلے ہندستانی عمرانیاتی جائزے کے مطابق اردو وسیع ترین ملک گیر پھیلاؤ پر قادر تھی۔ مارواڑی اور پھر ہندی کے بعد یہ وہ واحد زبان ہے جو 22 صوبوں اور مرکزی علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ چوتھے یہ کہ صوتیات، صرفیات اور اپنی ساخت کی بے پناہ لچک کی بنا پر اردو نے چار مختلف خاندانِ السنہ یعنی ہند آریائی، دراوڑی، سامی اور یورالی۔ السطائی کے درمیان پل کا کام کرتی رہی ہے۔ پانچویں یہ کہ ہندستان میں اردو زبان غیر منقسم حد تک مسلمانوں کی مذہبی اور تہذیبی شناخت میں پیوست ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کی نسلی شناخت اور اردو کے درمیان تفاعل کے سلسلے میں خاصی الجھن اور غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ اردو کے سیکولر اور اعتدال پسند دوستوں اور ہمدردوں کا یہ دعوا ہے کہ اردو بنیادی طور پر ایک سیکولر زبان ہے اور اسی لیے اسے کسی مخصوص (مسلم) فرقے سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ دوسری طرف مسلمان ادیبوں اور دانشوروں کی ایک بڑی تعداد یہ دلیل پیش کرتی ہے کہ تمام عملی مقاصد کے لیے اردو خصوصاً ہندستانی مسلمانوں کی زبان بن چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ دونوں طرف سے مبالغہ آرائی سے کام لیا جارہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مسئلے پر حالیہ ترین زمانے کے تاریخی، تہذیبی اور سیاسی سیاق میں غور کیا جائے۔ اس ضمن میں دو نکتے خاص طور سے ذہن نشیں رکھنے ہوں گے۔ اوّل یہ کہ نسلی لسانیات ہمیں یہ بتاتی ہے کہ زبان کی نسل پرستی یا نسلی شناخت ایک بہت اہم جہت کی تشکیل کرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم میں سے ہر فرد کی متعدد شناختیں ہیں اور یہ شناختیں زبان، مذہب، علاقائی ماحول، تہذیبی روایات، انسانی رشتوں، پیشہ ورانہ وابستگی اور قوم سے اخذ کی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض شناختیں روزن دار اور دوسرے میں مخلوط ہوتی ہیں۔ ذاتی سطح پر بات کی جائے تو اردو میری شناخت کا ایک اہم جز ہے صرف اس لیے نہیں کہ یہ میری مادری زبان ہے بلکہ اس حقیقت کی وجہ سے بھی کہ میں اس کے تئیں حساس ہو چکا ہوں اور یہ کہ میں نے اردو ذریعۂ تعلیم سے اپنے مذہبی و تہذیبی ورثے کو اپنے وجود میں اُتارا ہے۔ دوسری جانب میں اس حقیقت کا بھی احساس رکھتا ہوں کہ میں اپنی لسانی شناخت میں نہ صرف اردو بولنے والے مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوں بلکہ اردو بولنے والے ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ بھی۔ اس مفہوم میں ایک مشترک لسانی شناخت مذہبی تفریق سے بالاتر ہوجاتی ہے۔

جہاں تک موجودہ سیاق میں اردو کی مسلسل مقبولیت اور ترقی کا سوال ہے تو اس ضمن میں ہمارے سامنے امید وبیم کی کیفیت، تشنہ وعدوں، تنگ نظری اور لسانی عصبیت کی کہانی سنا رہی ہے۔ ایک طرف ہندستان میں اردو کے اخبارات و رسائل کی تعداد میں اضافہ، اردو غزل کی بڑھتی ہوئی مقبولیت، ٹیلی ویژن اور مرکزی دھارے کی فلموں میں اردو کے گانوں اور مکالموں کی عوامی پسندیدگی کو دیکھتے ہوئے اردو کا مستقبل تابناک نظر آتا ہے تو دوسری طرف ایسے باہم مربوط کئی مسائل ہیں جو اردو کی ترویج و ترقی کی راہ روک رہے ہیں۔ یہاں میں یہ اصرار یہ کہنا چاہوں گا کہ معاصر ہندستان میں اردو کی حیثیت کے مسئلے پر علاحدہ سے نہیں بلکہ آزادی کے بعد سے ہندستانی معاشرے میں جاری وسیع تر سیاسی نظریاتی اور سماجی و ثقافتی عوامل کے سیاق و سباق میں بحث ہونی چاہیے۔

ان دنوں معاشروں کو بااختیار بنانے (Empowerment) کے موضوع پر بڑی طویل بحثیں چل رہی ہیں۔ میرے خیال میں اختیار دہی کے معیار اور عدم اختیار دہی کی حقیقت کے درمیان حدِ فاصل کھینچنے کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ عدم اختیار دہی کی حرکیات کو سمجھنا

اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اختیار دہی کے لیے حکمتِ عملی وضع کرنا، کیوں کہ یہ دونوں ہی ناقابلِ تقسیم ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ گذشتہ پچاس برسوں میں ہندستان کے مسلم فرقے کو بڑے پیمانے پر عدم اختیار دہی کا تجربہ ہوا ہے۔ اس کا اظہار، پارلیمنٹ، صوبائی اسمبلیوں، مرکزی حکومت، پولیس اور نیم فوجی دستوں، پیشوں، نمایاں سیاسی جماعتوں، عدلیہ صنعت وتجارت، اعلا تعلیم کے اداروں اور ذرائع ابلاغ اور بیوروکریسی میں مسلمانوں کی واضح طور پر ناکافی نمائندگی سے ہوتا ہے۔ اس فرقے کی عدم اختیار دہی کی عکاسی پست معیارِ تعلیم، غربت، محرومی اور اقتصادی پسماندگی سے بھی ہوتی ہے۔ آزاد ہندستان میں اردو کی حیثیت، جو سیاسی اداروں کی دانستہ چشم پوشی، امتیاز اور بغاوت کی تصویر پیش کرتی ہے وہ مسلم فرقے کی عدم اختیار دہی کی وسیع تر حقیقت کا ایک لازمی جز بن چکی ہے۔ اتر پردیش کی ایک رپورٹ شاہد ہے کہ وہاں حکومت کی کفالت سے چلنے والا پرائمری سطح کا اردو ذریعۂ تعلیم کا ایک بھی اسکول فعال حالت میں نہیں ہے جب کہ یوپی نے اردو کی ترویج وترقی میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جہاں تک کہ اردو میں پڑھنے اور لکھنے کا سوال ہے اردو بولنے والی برادری سے تعلق رکھنے والی ایک پوری نسل ناخواندگی کا شکار ہو رہی ہے۔ اردو زبان کو ضرر پہنچانے والے عوامل کا ایسا حقیقت پسندانہ اور منصفانہ جائزہ لیا جانا چاہیے جو اسے فریب کن اور خوش فہم رجحانات کی دھند سے نکال سکے۔ یہ ایک ناگوار حقیقت ہے کہ اردو کو تشویشناک صورتِ حال سے ہمکنار کرنے میں خود اردو بولنے والوں اور خصوصاً مغرب زدہ اشراف کا بھی ہاتھ ہے۔ مغربی اثرات کے سحر میں گرفتار ہو کر وہ بڑے جوش وخروش کے ساتھ اپنے بچوں کو انگریزی ذریعۂ تعلیم کے اسکولوں میں بھیجتے ہیں اور انھیں گھر پر ابتدائی سطح کی بھی اردو پڑھانے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے معمولاتِ زندگی میں اردو کو کمترین اہمیت دی جاتی ہے۔ اردو کی واقفیت، اس زبان کی تدریس اور اس کی صحافت میں واضح طور پر گراوٹ آئی ہے۔ بدقسمتی سے اردو کا قلب سمجھے جانے والے مقامات پر کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں ایسا ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اردو کے معیار میں یہ گراوٹ مسلم فرقے کی ذہنی اور اخلاقی ڈھانچے کے عام کھوکھلے پن کا پیش خیمہ ہے۔

جہاں تک سوال ہے اردو زبان کے فروغ اور اس کی تعلیم کا، اس سلسلے میں مجھے چند مشاہدات پیش کرنے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگرچہ اردو اور مسلمانوں کی نسلی شناخت میں گہرا باہمی ربط ہے، اردو کے فروغ کے لیے صرف مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ ہندوؤں اور سکھوں کو بھی آگے بڑھنا چاہیے کیوں کہ ماضی میں اور حالیہ دہائیوں میں اردو کے فروغ میں ان تینوں فرقوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اردو کے فروغ کے لیے کوئی بھی حکمتِ عملی ہمارے معاشرے کے تکثیری و جمہوری دائرۂ کار میں وضع کی جائے۔ تیسرے یہ کہ حقیقی اختیار دہی یا مصنوعی اور علامتی اختیار دہی میں امتیاز کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ اردو کے فروغ کے مقصد سے اردو اخبارات اور رسائل کو سرکاری اشتہارات دینا اور اردو اکیڈمیوں اور دیگر اداروں کا قیام چند افراد کو ہی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ لسانی اختیار دہی کی سمت میں ایک اہم تر اقدام یہ ہوگا کہ آئینِ ہند کی دفعہ 350 الف کو ٹھوس شکل دی جائے جس میں کہا گیا ہے:

''ہر صوبے کے مقامی ذمے دار ان کی یہ کوشش ہوگی کہ لسانی اقلیتی گروہوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کو مادری زبان میں تعلیم دینے کے لیے پرائمری سطح پر مناسب سہولتیں فراہم کی جائیں اور ان سہولتوں کی فراہمی کی ضمانت کے لیے صدر جمہوریہ کی طرف سے ضروری اور مناسب ہدایات جاری کی جا سکتی ہیں۔''

اسی طرح یوپی کے سرکاری زبانوں کے قانون کی دفعہ 3 کی عبارت بھی اردو تعلیم کے خالص فروغ اور اس کی ترقی میں خاص معاون ہوگی۔

میرے خیال میں اردو کے فروغ کے لیے اہم ترین بنیادی ضرورت یہ ہے کہ اس معاملے میں اردو بولنے والے عوام اپنی مدد آپ، رضا کارانہ تنظیموں اور موثر عمل کے ذریعے اقدام کریں۔ مہاراشٹر میں اردو کی بہتر صورتِ حال اس بات کی روشن مثال ہے کہ منظم جدوجہد، مقصد سے وفاداری اور صبر وتحمل سے کیا کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اردو بولنے والوں کو شاعری، افسانہ اور ادبی تنقید اور مشاعروں کی مسحور کن فضاؤں سے باہر آنا چاہیے۔ ہمیں ضرورت ہے قدرتی اور سماجی علوم میں معتبر درسی کتب کی، سائنسی جرائد کی، اردو میں اعلا معیار کی صحافت کی، اردو کلاسیکی سرمائے کے سستے اڈیشنوں کی اور تکنیکی اصطلاحات کے تراجم کی۔ ان سب کے لیے صلاحیت، محنت اور لیاقت درکار ہے۔ معلومات کی دنیا میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے لائے ہوئے انقلاب کے ذریعے اردو کی ترقی کے امکانات کو بے پناہ وسعت دی جا سکتی ہے۔

اسلامی مدارس کے ملک گیر نظام نے اردو کے وسیع تر پھیلاؤ میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ تمام عملی مقاصد کے لیے ان مدارس میں ذریعۂ تعلیم اردو ہوتا ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان مدارس میں زیرِ تعلیم طلبہ نہ صرف ہندستان کے مختلف لسانی اور تہذیبی پس منظر سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ وہ یورپ، شمالی امریکا، افریقہ، آسٹریلیا اور ایشیا سے بھی ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ گذشتہ دو برسوں میں اسلامی فقہ اکیڈمی نے معروف ماہرینِ سماجی علوم کے لیکچروں

کے انعقاد اور سماجی علوم میں ضمنی مطالعات سے تعارف کے ذریعے مدارس کے طلبہ و اساتذہ کو سماجی علوم سے روشناس کرانے کا قابلِ تعریف اقدام کیا ہے۔ اردو زبان میں معتبر درسی کتب اور ضمنی مطالعات کی عدم دستیابی اس اقدام میں حائل رہی ہے۔ ملیشیا کی انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی نے راقم السطور سے اسلامی تناظر میں سماجیات کے موضوع پر ایک درسی کتاب تیار کرنے کی فرمائش کی جو مکمل ہو چکی ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس کتاب کا اردو میں ترجمہ ہوتا کہ اردوداں افراد عموماً اور مدارس کے طلبہ و اساتذہ خصوصاً اس سے استفادہ کر سکیں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ اردو زبان میں زندہ مسائل اور ہم عصر موضوعات پر جن میں مواصلاتی انقلاب، ماحولیاتی بحران، عالم کاری، بایوٹیکنالوجی، حقوقِ انسانی، عالم گیر نسلی اور مذہبی بیداری، تعمیرِ قوم کی راہ میں حائل دشواریاں اور نشیب و فراز شامل ہیں۔ کتابوں اور مضامین کا حقیقی معنوں میں فقدان ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہاں پر تین مسائل کا سامنا ہے۔ ایک طرف ان موضوعات پر قلم اٹھانے کی اہلیت کے حامل مسلم دانشور انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انگریزی اور دیگر زبانوں سے ترجمہ کرنے والے افراد کی افسوسناک حد تک کمی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ ان موضوعات پر لکھنے کی اہلیت رکھنے والے اسکالروں کے تئیں اردو اخبارات و رسائل کا رویہ بے نیازی اور لاتعلقی کا ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے اردو صحافت کی سطح اپنے معیار اور مواد کی وسعت اور زبان کے اعتبار سے برابر انحطاط کی طرف مائل ہے۔ یہ انحطاط ہندستانی مسلم فرقے کی تہذیبی اور فکری زندگی میں شدید درجے کی پستی کی طرف اشارہ کرتا محسوس ہوتا ہے۔

□□□

مترجم کا پتہ:
Dept. of Urdu, Jamia Millia Islamia,
New Delhi-110025

تحریکِ خلافت

مصنف: قاضی محمد عدیل عباسی

ہندستان میں چلائی جانے والی تحریکِ خلافت نے بالواسطہ طور پر ہماری تحریکِ آزادی کو بھی ایک نئی قوت عطا کی تھی۔ اس کتاب میں مصنف نے جو اس تحریک میں شریک تھے، تحریکِ خلافت کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 219 صفحات، قیمت 65.00 روپے

تالستائے

مصنف: ڈاکٹر محمد یٰسین

تالستائے کی تصانیف ہمیں خواب و خیال کی دنیا سے حقیقت کی طرف لے جاتی ہیں۔ اس کے یہاں حیات و کائنات کا عرفان بھی ہے اور عام انسانی جذبات و احساسات کی عکاسی بھی۔ اس کتاب میں تالستائے کے سوانحی گوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے فنی کارناموں پر بھی۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 152 صفحات، قیمت 46.00 روپے

بابرنامہ

تلخیص کار اور مترجم: ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی

''تزکِ بابری'' کی تلخیص اور آسان اردو میں ترجمہ۔ یہ تلخیص ان حصوں پر مشتمل ہے جن میں بابر نے بہ طور خاص ہندستان کے رسم و رواج، یہاں کے موسموں، یہاں کی آب و ہوا یہاں کے پھلوں اور پھولوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب بچوں کے لیے خصوصی دلچسپی کی حامل ہے۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 101 صفحات، قیمت 15.00 روپے

برنارڈ شا

مصنف: عبدالمغنی

جارج برنارڈ شا ایک روشن خیال اور انسان دوست ادیب اور مفکر تھا جو نسل یا قومیت کی حد بندیوں سے نکل کر پورے عالم انسانیت کی بہتری کا خواہاں تھا۔ اس کتاب میں برنارڈ شا کے شخصی اور ادبی اوصاف تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 96 صفحات، قیمت 35.00 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: دیپک کمار
ترجمہ: سہیل احمد فاروقی

اردو ذریعۂ تعلیم سے سائنسی علم تک رسائی: تاریخی تناظر

جنوبی ایشیا کو تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف سرچشموں اور دنیا کے تمام گوشوں سے کسبِ علم کا فخر حاصل رہا ہے۔ ایک طویل استعماری نظام کے مفلوج کن اثرات کے باوجود اس خطے نے فکر انگیز تہذیب کے وارث کی حیثیت سے عوام کی زبان کے ذریعے علم و دانش کے بنیادی سرمائے کو تقویت دینے کی ضرورت کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے۔

ہندستان کو فلسفیانہ اور مادی دونوں اعتبار سے ایک دیرینہ روایت ورثے میں ملی تھی۔ صدیوں پہلے سعید الاندلسی (1029 - 1070) نے اپنی تصنیف ''طبقات الامم'' میں (جو شاید سائنسی تاریخ کے موضوع پر کسی بھی زبان میں پہلی تحریر ہے) ہندستان کا ذکر اس پہلے ملک کی حیثیت سے کیا ہے جہاں مختلف سائنسی علوم کو استعماری عہد سے پہلے ہی فروغ دیا گیا۔ آگے چل کر ہندستان مابعد غزالی اسلام سے روشناس ہوا جس کی خصوصیت فلسفہ (عقلیت) کی شدید مخالفت تھی۔ اس کے باوجود بے شمار مسلمان دانشوروں نے عقلیت کی ہی کسوٹی کی حمایت کی لیکن اس طرح کہ منقول (یا روایتی علم) سے دست بردار نہ ہو جائیں۔ اسلامی دائرۂ کار میں ہونے والے مباحث کے ساتھ بین ثقافتی نمو پذیری کی متعدد کوششیں ہوئیں۔ اس کی مثالیں چودھویں صدی میں مہندر سوری کی طرف سے سنسکرت کی سدھانت کی روایت میں بھی عرب اور ایرانی فلکیات کو داخل کرنے کی کوشش میں دیکھی جا سکتی ہے اور میاں بھواہ کی ''مدینۃ الشفا سکندر شاہی'' میں بھی جس میں آیورویدا اور مغربی طبی روایات کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اٹھارھویں صدی کے اوائل میں لکھنؤ میں ملا نظام الدین فرنگی محلی نے منطق و مملکت پر حدیث کے مقابلے میں زبان پر زیادہ زور دیا۔ قبل از استعماریت ہندستان میں حواشی نویسی اپنے کمال پر تھی۔ اگرچہ ان علوم میں کوئی عملی تبدیلی نہیں آئی تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کورانہ تقلید کا نتیجہ تھے۔ بیشتر مثالوں (خصوصاً طب کے میدان میں) یہ حواشی سائنسی علم اس کی اپنی عقلیت اور منطق کے حوالے سے وضاحت کرتے ہیں۔ لیکن آخری تجربے میں جب کسی علم کی صحت کو پرکھا گیا تو مقدس صحائف کو ہمیشہ معیار بنایا گیا۔ تاہم کلاسیکی زبانوں میں تحریر کردہ متن کی گہری فہم اور بعض دفعہ خود کسی مستند ماخذ کے فقدان کی بنا پر کہنا مشکل ہے کہ ایک مخصوص فکر ہندستان میں کیوں نہیں پنپ سکی اور ایک نئی تکنیک کو کیوں نظر انداز کیا گیا۔ ایک بات بہرحال واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ہندستانی اجانب گزیدگی (Xenophobia) کا شکار نہیں تھے۔

جب ہندستان میں برطانوی حکمرانوں کی آمد کا آغاز ہوا تو اس وقت کے ہندستانی دانشوروں نے ان کے تئیں لاتعلقی اور گریز کا مظاہرہ کبھی نہیں کیا۔ مغرب سے تعامل جوں جوں بڑھتا گیا، انھوں نے اپنے باہر اور اندر کی دنیا کا جائزہ لینے کی پوری کوشش کی۔ مثال کے طور پر 1790 میں میر حسین اصفہانی نے ''رسالۂ حیاتِ انگریزی تصنیف کیا'' جو یورپی فلکیات پر فارسی متن کا نمونہ تھا۔ نئے حکمرانوں کی آمد کے ساتھ تراجم کے عہد کی ابتدا ہوئی۔ متعدد ہندستانی تصانیف کا ترجمہ انگریزی میں ہوا اور ایسی کئی انگریزی تحریریں تھیں جن کا ترجمہ فارسی میں کیا گیا۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں تراجم میں سرگرم دلچسپی دکھانے والے اوّلین شخص ماسٹر رام چندر تھے جو 1840 میں دہلی کالج میں ریاضیات کے معلم تھے۔ اپنے رسائل ''فوائد الناظرین'' اور ''محبِ ہند'' کے ذریعے وہ بے تکان توہم پرستی کے خلاف نبرد آزما رہے اور سائنس و ٹیکنالوجی، سائنسدانوں اور سائنسی مزاج جیسے اہم موضوعات پر متعدد مضامین قلم بند کیے۔ ان کی خواہش تھی کہ جدید تہذیب کے فوائد ایک ہندستانی زبان کے ذریعے عوام تک پہنچیں۔ رام چندر کے ایک معروف شاگرد منشی ذکاء اللہ نے ان کے کام کو آگے بڑھایا۔ منشی ذکاء اللہ نے جو خود فارسی و اردو کے اسکالر تھے، اردو کے ذریعے جدید سائنس کو مقبولِ عام بنانے کے لیے جدوجہد کی۔

وکٹوریائی ہندستان کے بلند قامت مصلحین میں سرسید کا شمار ہوتا تھا۔ 1864 میں انھوں نے علی گڑھ میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ اس سوسائٹی نے صنعتی اور زرعی پیداوار اور ٹیکنالوجی کے استعمال کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا۔ یہ کام عوام کو مغربی سائنسی اور تکنیکی ترقیات سے خود ان کی اپنی زبانوں میں متعارف کرائے بغیر ممکن نہ تھا۔ لہٰذا ترجمے کا ایک وسیع تر پروگرام وضع کیا گیا۔ جس کے تحت ایک رسالہ نکلنا شروع ہوا اور عوامی بیداری کے مقصد کے پیشِ نظر لیکچر منعقد کیے گئے۔ اس سوسائٹی نے اردو زبان میں ریاضی، الجبرا، علمِ مثلث، ارض پیمائی، میکانکس اور جدید زراعت کی بہت سی کتابیں ترجمہ کروائیں۔ ان کوششوں سے بہار کے ایک جج امداد علی نے تحریک پا کر مظفر پور میں 1868 میں بہار سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ 1867 میں علی گڑھ سوسائٹی

نے دیسی زبانوں کے ذریعے یورپی علوم کی تعلیم و تدریس کے لیے ایک عرضداشت داخل کر دی تھی۔ 1868 میں بہار سائنٹفک سوسائٹی نے بھی یہی کام کیا۔ اس سوسائٹی نے ''اخبارالاخیار'' کے عنوان سے ایک دو ماہی پرچہ نکالنا شروع کیا جس میں تعلیمی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ تاہم ان سوسائٹیوں کے ساتھ دقت یہ تھی کہ ان کا انحصار فردِ واحد پر تھا۔ علی گڑھ میں سرسید تھے تو بہار میں امداد علی جن کے بغیر سوسائٹی کا تصور رمحال تھا۔

اس کے علاوہ ان سوسائٹیوں کی سرگرمیوں میں ایک داخلی خامی تھی۔ وہ یہ کہ انھوں نے بڑے پیمانے پر نئے علوم کا دیسی زبان میں ترجمے کا بیڑہ تو اٹھا لیا تھا لیکن ترجمے کم از کم تصوراتی سطح پر مطلوبہ معیار کو نہ چھو سکے۔ ان تراجم کے پہلے یا بعد میں اصل متن نہیں ہوتا۔ اندازِ فکر، تکلم اور تحریر میں جابجا جھول تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں صرف ترجمہ ناکافی تھا۔

تاہم نئے علم اور ہندستانی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بناتے ہوئے اس سے بھی استفادے کی ضرورت ایک خاص مسکن اثر رکھتی تھی۔ یہاں تک کہ اردو شعرا جنھیں عموماً زندگی کے رومانی پہلوؤں کے لیے وقف تصور کیا جاتا تھا، مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف راغب ہو رہے تھے۔ مثال کے طور پر غالب نے بھاپ اور کوئلے کی طاقت کی بنیاد پر مغربی تہذیب کے کمالات کے بارے میں اظہارِ خیال کیا۔ حالی نے اپنی مسدس ''مدوجزرِ اسلام'' میں سائنس کو ایک قیمتی ہیرے سے مشابہ قرار دیا جسے اب تک کسی نے نہ پرکھا تھا۔

دو یادگار اقتباسات کے ساتھ میں اپنی گفتگو ختم کرنا چاہوں گا۔ ایک تو بڑے ہی اہم اسلامی ادیب کا ہے اور دوسرا ایک غیر معروف مسلم مولوی کا جس نے مستقبل کے ادراک کی کوشش کی۔

''دنیا میں سائنس کے سوا نہ کوئی حکمراں تھا، نہ ہے اور نہ ہوگا۔ اس وقت ہمارے علما چراغ کی اُس مہین بتی کی مانند ہیں جس کے سرے پر ننھا سا شعلہ رکھا ہے، جو نہ اپنے اطراف کو روشن کرتا ہے اور نہ ہی دوسروں کو روشنی دیتا ہے۔ سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ ہمارے علما نے آج سائنس کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک کو وہ مسلم سائنس کہتے ہیں اور دوسرے کو یورپی سائنس کا نام دیتے ہیں۔ اس تقسیم کی وجہ سے وہ دوسروں کو بعض مفید علوم پڑھانے سے روکتے ہیں۔''

مسلمان اپنے فلسفے کے ساتھ بعینہ یورپ کے معاصرین کے مقام پر ہیں یعنی یہ کہ انھوں نے حقیقی تہذیب کی سمت میں نصف سفر طے کیا ہے۔ نتیجتاً جب جدید اصلاحانہ فلسفہ ایک بار ان کے ذہن میں راہ پا جائے گا تو وہ اپنے ہمسائے ہندوؤں کے مقابلے میں زیادہ تیز رفتاری سے ترقی کر سکیں گے۔ شاید ہمارے درمیان نیوٹن کی فکر سے متاثر کوئی بوعلی سینا یا کوپرنیکس کا حامی ابنِ رشد پیدا ہو جو خود حامیانِ بوعلی سینا اور ابنِ رشد پر تنقیدی نگاہ ڈالے۔

(مولوی عبیداللہ۔ ہندستانی مسلمانوں کے ذہن پر مغربی تعلیم کے ممکنہ اثرات۔ کلکتہ-1877)۔

□□□

مترجم کا پتہ:
Dept. of Urdu, Jamia Millia Islamia,
New Delhi-110025

اردو زبان کی تدریس

معین الدین

اردو کیسے پڑھی اور پڑھائی جائے درس و تدریس کے جدید سائنٹفک اصولوں کی روشنی میں تدریسی طریقۂ کار کا تعین طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے یکساں مفید۔

پانچواں ایڈیشن

صفحات: 148 ، قیمت: 29.00 روپے

ہندستان کا شاندار ماضی

مصنف: اے ایل باشم

مترجم: سید غلام سمنانی

ہندستان کے قدیم تہذیب و تمدن کا مفصل اور مکمل تعارف مستند تاریخی شواہد کی روشنی میں

دوسرا ایڈیشن

صفحات: 748 ، قیمت: 145.00 روپے

اتر پردیش کے لوک گیت

اظہر علی فاروقی

ہمارے لوک گیتوں میں ہندوستان کی عوامی زندگی کی بھرپور ترجمانی ہوئی ہے۔ اس کتاب میں اظہر علی فاروقی نے اتر پردیش کے وہ تمام گیت یکجا کر دیے ہیں جو مختلف موقعوں پر عوام کے دکھ سکھ کی ترجمانی کرتے ہیں

صفحات: 652 ، قیمت: 120.00 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: ہریش نارنگ
ترجمہ: سہیل احمد فاروقی

زبان کی تعلیم و تدریس اور تہذیبی بقا

(ہندستان میں اردو کا سماجی و تاریخی پس منظر)

کوئی بھی زبان کچھ مخصوص سماجی و تاریخی سیاق اور مخصوص سیاسی و تہذیبی فضا میں پیدا ہوتی، ترقی کرتی اور زوال سے ہم کنار ہوتی ہے۔ کہنے کا منشا یہ ہے کہ اپنے ارتقا کے مراحل میں کوئی انسانی گروہ اپنی ترسیلی ضروریات کے لیے کسی وسیلۂ اظہار کی تشکیل کرتا ہے۔ بعد میں افراد نہ صرف اس وسیلہ اظہار و ترسیل کی حفاظت کرتے ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر اس کی پرداخت و ترقی کی ذمے داری بھی نبھاتے ہیں، اس طرح کہ وہ ہمہ وقت اسے نہ صرف اس کے موجودہ اور متوقع استفادہ کنندگان کے لیے مزید کارآمد اور قابلِ رسائی بناتے رہتے ہیں بلکہ وہ اسے اپنے ادبی اظہار کے وسیلے کی شکل دینے میں بھی مصروف رہتے ہیں، اپنے تہذیبی ورثے کے تحفظ کے ایک وسیلے کی شکل دینے میں۔ وقت کے ساتھ ساتھ کوئی بھی زبان لوگوں کے دیگر مادی و روحانی و تجریدی اکتسابات کے مانند ان کی شخصیت سے وابستہ ہو جاتی ہے اور ان کے وجود کا اٹوٹ حصہ بن جاتی ہے۔ زبان اس حد تک ان کی شانِ امتیاز بن جاتی ہے کہ اگر کوئی لسانی معاشرہ بعض جغرافیائی یا سیاسی وجوہ سے منقسم ہو جاتا ہے تو اس کے بولنے والے خود ایک ہی زبان کے اندر رہتے ہوئے بیشتر اوقات دیدہ و دانستہ مختلف امتیازی علائم کی تشکیل کر لیتے ہیں اور یہ دعوا کرنے لگ جاتے ہیں کہ وہ دو مختلف زبانیں بولنے والے ہیں۔ مثال کے طور پر چینی، فرانسیسی، تمل، ہندی، انگریزی اور جرمن اپنی متعلقہ لسانی برادری کے لیے نہ صرف امتیازی علائم ہیں بلکہ انھیں کئی اعتبار سے مختلف معاشروں کے درمیان حدِ فاصل کھینچنے کے کام میں لایا جاتا ہے۔

چوں کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ کوئی زبان کسی معاشرے کے افراد کے وجود کی شناخت بن جاتی ہے، اس لیے وہ بڑے جوش سے اس کی حفاظت کرتے ہیں اور دیگر لسانی Predators سے اسے محفوظ رکھنے کے لیے جن سے اس کا واسطہ مختلف تجارتی، سیاسی یا تہذیبی وجوہ سے پڑ سکتا ہو، ہر ممکن سعی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر فرانسیسی عوام اپنی زبان میں انگریزی زبان کے الفاظ کی دراندازی سے نالاں ہیں۔ آسامیوں نے اپنی زبان کو بنگلہ رسم خط کے زیرِ نگیں لانے سے انکار کر کے اپنی زبان کے تحفظ کے لیے جہاد کیا۔

اردو مذکورہ بالا ضوابط سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہ ہندستان بلکہ شمالی ہند میں بشمول دہلی موجودہ مغربی اترپردیش میں پیدا ہوئی تھی۔ محققین کا کہنا ہے کہ اردو لشکروں یا افواج کے درمیان لسانی تعلق کی غرض سے وجود میں آئی تھی لیکن جلد ہی ترقی کر کے اُس نے ایک اہم عوامی زبان کی حیثیت اختیار کر لی۔ جیسا کہ دنیا کی تمام زبانوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے، اس کے بولنے والوں نے وقت کے ساتھ اسے اپنے وجود کی علامت بنایا اور جہاں بھی گئے اسے اپنے ہمراہ لے گئے۔ یہاں میں یہ واضح کردوں کہ اردو بولنے والے افراد طبقاتی، مذہبی اور ذات پات کی تفریق سے بالاتر ہو کر معاشرے کے ہر طبقے سے آئے تھے اور جب آزادی کے موقعے پر ملک کی تقسیم ہوئی تو اردو ایک سے زیادہ قوموں کی زبان قرار پائی۔ بنگلہ دیش کے خود مختار قوم کا درجہ حاصل کر لینے کے بعد اردو برِ صغیر ہند کی ایک اہم زبان بن گئی۔

یہ سیاسی حالات کا ہیر پھیر اور لسانی کرتب بازی تھی جس کے ہاتھوں اردو پاکستان کی سرکاری زبان بن گئی۔ ہندستان میں اسے بڑے پیمانے پر تعصب کا سامنا تقسیم کے بعد کرنا پڑا۔ ملک کی تشدد آمیز تقسیم کے دور میں تلخی سے بوجھل فضا میں پورے ملک کے عوام میں اردو کی بڑھتی ہوئی شہرت سے بیزار مفاد پرست عناصر نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھایا۔ اسے ستم ظریفی ہی کہا جائے گا کہ اردو پاکستان سے وابستہ کر دی گئی جہاں تقسیم کے دوران تازہ بہ تازہ وارد ہونے والے مہاجروں کے سوا کوئی بھی اسے اپنی مادری زبان کے طور پر بولتا نہ تھا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ پاکستان سے اس وابستگی کو بہانہ بنا کر اردو کی ہندستانی اصل سے انکار کیا گیا اور اس کے بولنے والوں کو اردگرد کی سماجی و تہذیبی فضا سے منقطع کر دیا گیا۔

بدخواہانہ خیال آرائی کے تحت یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور چوں کہ پاکستان ایک مسلم ریاست کے طور پر وجود میں آیا اس لیے فطری طور پر اردو کا تعلق پاکستان سے ہوا۔

لیکن حقیقت سے بعید کوئی بات چل نہیں سکتی تھی۔ ملک کے دیگر حصوں میں آباد مسلمان اردو کی کوئی واقفیت نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی ان کا

● یہ مضمون 1999 میں منعقدہ قومی اردو کونسل کے سمینار ''اردو زبان کے فروغ کا ایجنڈا'' کے لیے تحریر کیا گیا تھا۔

کبھی یہ دعوا رہا کہ اردو ان کی مادری زبان ہے۔ مثلاً کیرالا کے مسلمان ملیالم بولتے تھے، تمل ناڈو میں وہ تمل بولتے تھے، آندھرا پردیش والے تلگو بولتے رہے اور گجرات کے مسلمانوں کی زبان گجراتی رہی۔ یہاں تک کہ پنجاب کے شمال میں لوگ پنجابی بولتے تھے۔ لیکن ہندی کے شدت پسند حامی جنھیں اردو بولنے والوں کے ساتھ ایک ہی جغرافیائی و تہذیبی خطے میں رہنا تھا اور جنھیں اردو کی مقبولیت سے سب سے زیادہ خطرہ لاحق تھا، انھوں نے یہ مشہور کرنے کی کوشش کی کہ اردو اسلام کی زبان ہے اور اس طرح انھوں نے غیر مسلم اردو بولنے والوں کو یہ ترغیب دینے کی کوشش کی کہ وہ مذہبی بنیاد پر اس زبان کا استعمال ترک کر دیں۔ یہ تصور بھی پوری طرح باطل تھا کیوں کہ اسلامی مذہبی مباحثے کی زبان عربی ہے نہ کہ اردو، اور دونوں زبانوں کے درمیان مماثلت حقیقی سے زیادہ بصری نوعیت کی ہے۔ تاہم یہ آزاد ہندستان میں وہ زہر آلود سماجی و سیاسی فضا تھی جس میں پاکستان بحیثیت دینی ریاست کے بمقابل ہندو مذہبی ریاست کے خانے میں رکھنے کی خواہش مند فرقہ پرست طاقتیں بڑی حد تک ''اردو بمقابل ہندی'' جھگڑے کو اسی انداز میں پیش کرنے میں کامیاب ہو گئیں، جس انداز میں انھوں نے (بشمول ایک بڑے غیر مسلم اردو داں طبقے کے) بہت سے ہندستانیوں کے ذہن میں مسلمان بمقابل ہندو کا تصور بٹھایا تھا۔

جب 1956 میں صوبوں کی لسانی تشکیلِ نو، بنیادی طور پر زبانوں اور خصوصاً نمایاں زبانوں کو جغرافیائی خطوں سے منسوب کرنے کی غرض سے کی گئی تو اردو کو اتر پردیش کی سرکاری زبان بنانے یا کم از کم اس صوبے کے ایک حصے کو اس کا مخصوص خطہ قرار دینے کے بجائے اسے جموں و کشمیر کی زبان بنا دیا گیا جو ایک ایسا صوبہ ہے جہاں عوام کی اکثریت کشمیری یا ڈوگری یا لداخی بولتی ہے۔ چوں کہ جمہوریۂ ہند میں یہ واحد ایسا صوبہ تھا جہاں مسلمان اکثریت میں تھے، اردو کو اس صوبے کی سرکاری زبان قرار دے کر پہلے ہی سے تیزی سے پھیلتے ہوئے اس زہریلے پروپیگنڈے کو اور تقویت دی گئی کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ جموں و کشمیر کے ہند و پاکستان کے درمیان پہلے ہی متنازعہ خطہ بن جانے کی بنیاد پر اردو کا ہندستانی زبان ہونے کا دعوا بھی ایک مغالطہ آمیز منطقی تنازعے کا شکار ہو گیا۔ اردو کے جموں و کشمیر کی سرکاری زبان بننے سے ہندی کے مرکزی خطے میں اردو مخالف مفاد پرست عناصر کو، ہندوؤں، خصوصاً آزاد ہندستان میں پروان چڑھنے والی نسل کے اردو سیکھنے کے خلاف کھلے عام پروپیگنڈہ کرنے کا ایک سنہرا موقع ہاتھ آ گیا۔ اس طرح Geobbleism کے ایک ہی بڑے جھٹکے میں خصوصاً شمالی ہندستان میں ملک کی آبادی کا ایک بڑا حصہ اپنی اہم ترین تہذیبی جڑوں سے کاٹ دیا گیا۔

یہی وہ اسباب تھے جن کے باعث اردو سیکھنے اور بولنے والوں کی تعداد شمالی ہند اور خصوصاً اتر پردیش میں حد درجہ گھٹ گئی۔ اردو کو اپنی مادری زبان درج کرانے کے لیے غیر مسلم اردو داں افراد کی اسی طرح حوصلہ شکنی کی گئی جس طرح ایک زمانے میں پنجاب میں غیر سکھ پنجابیوں کی حوصلہ افزائی ہندی کو اپنی مادری زبان درج کرانے کے لیے کی گئی تھی۔ بدقسمتی سے پنجاب کے غیر سکھ پنجابیوں کی طرح شمالی ہند کے اردو داں طبقے کے پاس زبان کشی کی مہم سے نبرد آزما ہونے کا نہ تو حوصلہ تھا اور نہ ہی کوئی سرکاری حربہ۔ اتفاق سے ان دونوں تحریکوں کے پسِ پشت جو اردو کے خلاف شمالی ہند میں اور پنجابی کے خلاف پنجاب میں چل رہی تھیں، یکساں ہی نوعیت کی فرقہ وارانہ طاقتیں کام کر رہی تھیں اور ان کی ترغیبات بھی یکساں تھیں یعنی اقلیتی زبانوں کا گلا گھونٹنا تاکہ اقلیتی تہذیبیں خود ہی دم توڑ دیں اور اس طرح وہ ہندستان میں یک تہذیبی و یک لسانی رجحان کے سیاسی ایجنڈے کو فروغ دے سکیں۔ یہ بات ایک متحرک وحدت کے اندر تکثیریت کی تخلیق کے قومی مقصد سے براہِ راست متصادم تھی۔

اردو کے اس بچے کھچے طبقے کے درمیان جواب کم از کم بنیادی طور پر مسلمانوں پر مشتمل تھا، اتر پردیش میں اردو کی تعلیم و تدریس کی سہولیات کو بتدریج گھٹانے اور انھیں اردو سیکھنے کے لیے مدرسوں کا رخ کرنے پر مجبور کرنے میں ان چالوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ اسی سے آگے چل کر اس پروپیگنڈے کو تقویت ملی کہ اردو محض مسلمانوں کی زبان ہے۔ اس طرح اس زبان کو آفیشیلی سیکھنے کی کمیاب ہوتی سہولتوں نے اسے غیر رسمی / غیر منظم اداروں میں مواقع تلاش کرنے پر مجبور کیا جس کے نتیجے میں اسے سیکھنے کے مواقع مزید محدود ہو گئے۔

اس کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ ہندستان میں اردو کا وجود مٹانے کے لیے ایک علمی محاذ کھولا گیا۔ اردو کے خلاف کھلم کھلا عناد اور ہندی کے لیے نرم گوشہ رکھنے والے ماہرینِ لسانیات نے یہ دلیل پیش کی کہ چوں کہ دونوں زبانوں میں جملے کی ساخت ایک ہے اس لیے بنیادی طور پر وہ ایک ہی زبان ہیں۔ دونوں زبانوں کے صوتیاتی، تحریری، صرفی اور لفظی فرق کو نظر انداز کر دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس موضوع کے بعض نام نہاد اسکالر ایک مرکب نام ''ہندی۔ اردو'' رکھنے پر آمادہ ہو گئے اور بعض زیادہ ہی فریبی اسکالروں نے اس پر ''اردو'' کا لیبل چسپاں کر دیا کہ یہ لفظ ''ہندو'' سے قریب تر تھا۔ چونکہ کسی نے بھی ہندی کی خود مختاری پر انگلی نہیں اٹھائی، یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس کے پسِ پردہ اردو کو ہندی میں مدغم کرنے کی کوشش پنہاں تھی۔ اسی طرح جیسے ہندوؤں نے سکھوں، بودھوں اور جینیوں کو ہندو مت میں مدغم کرنے کی کوشش کی۔

جب پیٹھ دیوار سے لگ ہی گئی تو اردو کے اصل بولنے والوں نے اردو ذریعہ تعلیم سے آفیشل تعلیم کے حصول کی سہولت کی فراہمی کا اضافی مطالبہ آگے بڑھایا۔ اور یہ مطالبہ اقلیتی زبان کے بولنے والوں کی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے دستورِ ہند میں درج دفعات میں مذکور سہولتوں کے عین مطابق تھا۔ بنیادی حقیقت یہ سامنے آئی کہ اگر اردو سیکھنے کے مواقع میں تخفیف کردی جائے تو رسمی تعلیم کے تحت مختلف مضامین پڑھانے والوں کی حیثیت سے اساتذہ کی دستیابی اپنے آپ کم ہو جائے گی۔ اس طرح کی سہولتیں کہیں کہیں اردو داں اساتذہ کی تقرری سے حاصل ہوئی تھیں۔ تاہم ان علاقوں میں جہاں اردو بولنے والے اکثریت میں تھے، یہ سہولت فراہم نہیں کرائی گئی۔ مجبوراً محرومی اور ٹاٹ باہر کیے جانے کے احساس کے شکار اردو داں والدین کے ایک بڑے حصے نے اپنے بچوں کو سرکاری تعلیم کے نظام سے ہٹا کر مدرسے کی تعلیم میں لگادیا۔

بظاہر مدرسہ نظام مذہبی اور تہذیبی تعلیم دینے کے وسائل سے آراستہ تھا، جس کی رسمی تعلیم سے ہم سری کا کسی طرح بھی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ستم ظریفی یہ کہ معاشرے کا یہی کمزور تر طبقہ تھا جسے سماجی و اقتصادی زینے پر چڑھنے کے لیے رسمی تعلیم کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ اتر پردیش میں سرکاری مشینری نے نہ صرف اردو کی تعلیم / تدریس بلکہ زبان بولنے والوں کی رسمی تعلیم کے مواقع تنگ کرنے کے منشور کو آگے بڑھایا۔

ایک مہلک فیصلے میں اتر پردیش اسکول ایجوکیشن بورڈ نے طلبہ کو اسکول میں بحیثیت ایک مضمون کے اردو یا انگریزی پڑھنے کے انتخاب کا اختیار دیا۔ یہ اچھی طرح جانتے ہوئے کہ اردو بولنے والوں کے لیے (جو اسے بجا طور پر اپنے وجود کی شناخت کا ذریعہ سمجھتے تھے) اردو سیکھنا ایک جذباتی مسئلہ ہے، فرقہ وارانہ تعصب سے مغلوب بیوروکریٹوں نے اردو بحیثیت ایک مضمون پڑھنے کے خواہش مند طبقے سے بہت بڑی قیمت کا مطالبہ کیا تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ہندستان میں انگریزی زبان پر خاطر خواہ قدرت سے انھیں محروم کردینا ان تمام مواقع سے منقطع کردینے کے مترادف ہوگا جن کی سرحد میں داخلے کے لیے انگریزی پروانۂ سفر سے کم نہیں۔

جیسا کہ مندرجہ بالا معروضات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے، ہندستان میں اردو کی بقا و فروغ کے مخالف افراد پہلے ہی سے جانتے تھے کہ زبان کی بقا کا اس کے بولنے والوں کی تہذیبی اقدار و روایات کے وجود و بقا سے جیسا کہ شروع میں راقم السطور نے کہا ہے، خود ان کے وجود سے اٹوٹ رشتہ ہے۔ چوں کہ یہ افراد اپنے سماجی و سیاسی رجحانات کے اعتبار سے فرقہ پرست اور ہندستانی مسلمان دشمن تھے لہٰذا انھوں نے مسلمانوں کو زیر کرنے کے لیے ان کی زبان کو حربہ بنایا۔ اپنی ناپاک سازشوں کی پردہ پوشی کے لیے ظاہری طور پر وہ اردو کی بعض فرسودہ اصناف اور ادبی اظہار کے چند اسالیب پر تحسین و آفریں کہتے رہے۔ اس طرح قوالی، غزل، نظم وغیرہ کو تو مشاعروں اور بمبیا فلموں میں جگہ دی گئی لیکن ادبی اظہار کی زیادہ استدلالی اصناف مثلاً ناول اور مختصر افسانے پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ جس کی صاف وجہ یہ تھی کہ یہ اصناف اپنے قارئین تک زیادہ تفصیلی اور مؤثر سماجی و سیاسی پیغام پہنچا سکتی تھیں۔ ان کی نیت یہ تھی کہ ادبی اظہار کے قدیم اسالیب کو زندہ رہنے اور وقت کے ساتھ ختم ہوجانے کے لیے چھوڑ دیا جائے، کیوں کہ ان کی قوت کے سرچشموں کی خشکی کا سامان کیا ہی جاچکا تھا مگر افسانہ اور ناول جیسے جدید اسالیب کو پنپنے کا موقع نہ دیا جائے۔

میں اپنی بات اس خیال کے اظہار کے ساتھ ختم کرنا چاہوں گا کہ اردو تعلیم / تدریس کی لڑائی صرف زبان کی بقا کی ہی جنگ نہیں ہے، یہ محض ایک جذباتی مسئلہ نہیں ہے، یہ ایک نمایاں اقلیتی تہذیبی فضا کے بقا کی جنگ ہے جو اس کے بولنے والوں کے بقا کی شرطِ اولین ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی پیدائش کے علاقے میں اس کا احیا ہو یعنی ان جغرافیائی حدود میں جہاں اس کے بولنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور وہ علاقہ اتر پردیش ہے۔ ان سب سے بڑھ کر ضروری ہے کہ اس زبان کا احیا رسمی تعلیمی نظام کے ایک حصے کے طور پر کیا جائے۔

ایک بار یہ واضح ہو جانے پر کہ اردو تعلیم / تدریس کے لیے یہ اہداف اردو کے احیا کے لیے حتماً لازم ہیں، ہم ضروری خارجی امداد کے ساتھ کلاس روم میں زبان کی تدریس کے جدید طریقوں اور ذرائع پر تفصیلی گفتگو کرسکتے ہیں۔ اس سیاق میں 1996 میں الٰہ آباد ہائی کورٹ کی طرف سے اردو کو اتر پردیش میں دوسری سرکاری زبان کی حیثیت دیے جانے کا فیصلہ بہت اہمیت اختیار کر جاتا ہے کیوں کہ اس کے سہارے ہم نہ صرف بحیثیت زبان اور بحیثیت ایک مضمون کے بلکہ ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے بھی اردو تعلیم / تدریس کے منصفانہ احیا کا مطالبہ کرسکتے ہیں۔ پھر ہم اسکول ایجوکیشن کی سطح پر اردو یا انگریزی کے انتخاب کی جگہ ایک زیادہ حقیقت پسندانہ اور پسندیدہ انتخاب کا مطالبہ کرسکتے ہیں یعنی کہ اسکول کے نصاب میں اردو اور انگریزی دونوں کو جگہ دی جائے۔

□□□

Centre for Linguistics and English
School of Language, Literature and Culture
Studies, JNU, New Delhi -110 067

جمیل اختر

اردو ـــــ دوسری سرکاری زبان اور ہماری ذمّے داریاں

دلی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل چکا ہے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو اردو تنظیموں کی جانب سے مبارک بادیاں دی جارہی ہیں اور ان کا شکریہ ادا کیاجارہا ہے۔ اردو والوں کے چہرے فرطِ مسرت سے کھلے ہوئے ہیں کہ ان کا پچاس سال پرانا مطالبہ پورا ہوا ہے ـــ لیکن کیا قانون بن جانے، مبارک بادیاں دے دینے، شکریہ ادا کردینے اور خوشیاں منا لینے سے ہی اردو کا بھلا ہوجائے گا؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ ضرورت ہے عملی اقدام کی، ضرورت ہے اس قانون کو عملاً نافذ کروانے کی، ضرورت ہے اس قانون کے سہارے اردو کی ترقی اور اس کے فروغ کے لیے عملی منصوبے بنانے کی اور میدانِ عمل میں آکر سرگرم کردار ادا کرنے کی۔ حکومت نے اپنی ذمے داری ادا کردی، آپ کے مطالبے پورے کردیے۔ یہ الگ بات ہے کہ مطالبے کس حد تک پورے ہوئے اور اس قانون سے اردو کا کس حد تک بھلا ہوگا۔ ایک حلقہ اس قانون کو اردو والوں کے ساتھ ایک بھونڈا مذاق بھی قرار دے رہا ہے۔ کہتا ہے کہ جن چار کاموں کے لیے اردو کے استعمال کی بات کی گئی ہے وہ فرمان تو 1958 میں ہی آیا تھا جب وزارتِ داخلہ نے ایک بیان جاری کیا تھا۔ اس میں ان چار کاموں کے علاوہ اردو تعلیم کا بھی ذکر ہے۔ لہٰذا یہ قانون تو پہلے حکم نامے سے بھی کم ہے۔ اگر اس قسم کا کوئی فرمان موجود تھا تو پھر بل لانے اور اس قانون کو بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ظاہری بات ہے کہ فرمان اور قانون میں بہت فرق ہے ـــ سابقہ فرمان صرف فرمان ہی رہا، باضابطہ قانون نہیں بن سکا اور ایک خاص مدت کے بعد اس کی اہمیت زائل ہوگئی۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ ایسا کوئی قانون لایا جائے اور یہ قانون اب بن گیا ہے۔

اب سوال موجودہ قانون سے اطمینان اور عدم اطمینان کا نہیں۔ سوچنا یہ ہے کہ جہاں کچھ بھی نہیں تھا، وہاں کچھ تو ہوا۔ ایک راستہ تو ملا، ایک دروازہ تو کھلا، جن چار کاموں کے لیے یہ سہولت فراہم کی گئی ہے، ان کا ہی عملی نفاذ اگر آپ مکمل طور پر کروانے میں کامیاب ہوگئے تو اردو کا بہت بھلا ہوگا۔ زبان اپنے بولنے والوں اور اس کو برتنے والوں کے طرزِ عمل سے زندہ رہتی اور ترقی کرتی ہے۔ کوئی حکومت کسی بھی زبان کی ترقی کی ضامن نہیں بن سکتی جب تک اس زبان کو بولنے والے خود آگے نہ آئیں۔ ہم نے ساری ذمے داری حکومت پر ڈال کر اپنے کو بری الذمہ کرلیا ہے اور صرف گلے شکوے کرتے رہے کہ حکومت کچھ نہیں کررہی ہے۔ جب کہ حکومت کی طرف سے دی گئی مراعات اور سہولتوں کا بھی ہم استعمال نہیں کرپائے۔ ہمیں اپنا احتساب کرنا چاہیے کہ ہم نے اپنی زبان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ اردو تعلیم ہم نے ترک کی، اردو اسکولوں میں اپنے بچوں کو بھیجنا ہم نے بند کیا، اردو اخبارات و رسائل کا خریدنا اور پڑھنا ہم نے چھوڑا، اردو تہذیب کو خیرباد ہم نے کہا۔ ابو، امی کی جگہ ڈیڈی، ممی بولنے کو ترجیح ہم نے دی، اپنی زبان کی ہزار خرابیاں ہم نے بیان کیں۔ ذرا سوچیے ہم نے کبھی اپنی زبان کی خوبیوں کا ذکر کیا؟ اس کے کلچر کی اچھائیوں کو اجاگر کیا؟ مشترکہ تہذیب کے فوائد، ملکی سالمیت اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو برقرار رکھنے میں اس کے ماضی کے رول کو پراثر انداز میں اجاگر کیا؟ جب اپنی زبان کا دفاع ہم خود نہیں کرسکے تو الزام کس پہ عائد کررہے ہیں؟

قانون تو بن گیا۔ اب اس کے عملی نفاذ کے لیے کوشش کرنا ہمارا کام ہے۔ ایسا نہ ہو کہ 58 کے ایکٹ کی طرح یہ قانون بھی فائلوں میں محدود ہوجائے۔ ہمارے لیے عملی کام یہ ہے کہ سرکاری دفاتر میں اپنے ہر کام کے لیے عرضیاں صرف اردو میں دیں۔ ممکن ہے اردو میں درخواست دینے کی وجہ سے آپ کا کام کچھ تاخیر سے ہو لیکن اپنی زبان کی خاطر صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس تاخیر کو گوارا کیجیے۔ بالفرض کام نہ ہو پھر بھی بددل نہ ہوں، دوبارہ درخواست دیں اور اردو ہی میں دیں۔ صوبائی حکومت کے دفاتر نیچے سے اوپر تک کتنے ہیں۔ اگر تمام دفاتر میں اچھی خاصی تعداد میں اردو درخواستیں روزانہ آنے لگیں تو تمام درخواستیں پھینک تو نہیں دی جائیں گی، یقیناً ان پر عمل درآمد کی کوئی صورت متعلقہ افسر نکالے گا۔ دفاتر میں مترجم بحال کیے جائیں گے، ٹائپسٹ بحال کیے جائیں گے، اردو افسر بحال کیے جائیں گے۔ اگر آپ نے یہ کام منصوبہ بند طریقے سے کیا اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دی تو اردو کے چلن کو عام ہونے سے کوئی روک نہیں سکے گا۔ چوں کہ آپ کو یہ حق قانونی طور پر ملا ہے اس لیے کوئی افسر اغماض نہیں کرسکے گا۔ یہ کام ہمارے کرنے کا ہے۔ حکومت ہماری طرف سے اردو میں درخواست نہیں دے گی۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بہار کی صورتِ حال ہمارے سامنے ہے۔ اردو والوں کی بے حسی کی وجہ سے اردو قانون آج وہاں عملی صورت میں باقی نہیں ہے۔ جس وقت اردو بہار کی دوسری سرکاری زبان بنی تھی تو بلاک کی سطح سے لے کر ضلعی اور صوبائی سرکار کے تمام دفاتر میں مترجم، نائب مترجم اور

اردو ٹائپسٹ بحال کیے گئے تھے، وہ آج تک بحال ہیں لیکن اردو درخواستیں موصول نہ ہونے کی وجہ سے مترجم اور دوسرے لوگ دفتروں کے دوسرے کام کررہے ہیں اور حکومت نے مترجم، نائب مترجم اور ٹائپسٹ کی مزید ہونے والی بحالیاں روک دی ہیں۔

اس قانون کو عملی صورت میں نافذ کروانے کے لیے اردو والوں کو سرگرم کردار ادا کرنا ہوگا۔ اور کچھ عملی قدم اٹھانے ہوں گے۔ مثلاً

1- ہمیں محلّے محلّے اردو والوں کا ایک دستہ بنانا ہوگا جو لوگوں کو اردو میں درخواستیں دینے کی ترغیب دے۔

2- مساجد کے اماموں کے ذریعے جمعہ کے خطبوں میں اردو میں کام کرنے کی یاددہانی کرائی جائے۔

3- بلاک سطح سے لے کر اوپری سطح تک ہر آفس کے لیے پانچ ذمے دار افراد کی کمیٹی بنائی جائے جو اس قانون کے عملی نفاذ میں آنے والی دشواریوں پر نظر رکھے اور ان کے تدارک کی کوشش کرے۔

4- اشتہار، پوسٹر، بینر اور ہینڈبل کے ذریعے لوگوں کو بیدار کرنے کی ایک منظم مہم چلائی جائے۔

5- کیبل ٹی وی کے ذریعے ٹی وی پر اشتہار دے کر لوگوں کو باخبر کیا جائے۔ عوامی بیداری کی مہم جب تک نہیں چلے گی، اس قانون کا بااثر عملی نفاذ ممکن نہیں ہو سکے گا۔

ایک اہم کام اپنے بچوں کو مادری زبان میں تعلیم دلوانے کا ہے لیکن اگر آپ کسی ایسے اسکول میں ہیں جہاں اردو تعلیم کا نظم نہیں ہے تو گھر پر اپنی مصروفیات سے تھوڑا وقت بچا کر روزانہ کم از کم ایک گھنٹہ اپنے بچوں کو اردو پڑھانے پر صرف کریں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح دوسری لسانی اقلیتیں اپنی زبان کی حفاظت کے لیے کررہی ہیں۔

دلی میں اردو آبادی کم وبیش ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے لیکن پرانی دلی اور نظام الدین کو چھوڑ کر آخر کیا وجہ ہے کہ بقیہ علاقوں میں اردو کے رسالے، کتابیں اور اخبارات نہیں ملتے۔ اردو کی کتابیں یا رسالے خریدنے کے لیے پرانی دلی کا سفر کیجیے۔ اس صورتِ حال پر بھی سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ حکومت نے ہمیں ایک موقع فراہم کیا ہے ہم اس سے فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کریں۔

ظاہر ہے کہ صورتِ حال راتوں رات نہیں بدل جائے گی، اس میں وقت لگے گا لیکن اس کے لیے جس جدوجہد کی ضرورت ہے، اس سے ہمیں جی نہیں چرانا چاہیے۔ ☐☐☐

314, Meer Singh House, Munirka Village,
New Delhi-67

اہلِ اردو کے دیرینہ خوابوں کی تعبیر

اردو انسائیکلوپیڈیا

جو بین الاقوامی معیار کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے

32 علوم پر مشتمل تین کلیدی جلدیں شائع ہوگئیں

قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نے اردو میں پہلا مکمل اور بین الاقوامی معیار کا انسائیکلوپیڈیا شائع کیا ہے۔ ابتدائی تین جلدیں 32 علوم پر مشتمل ہیں۔ جملہ علوم پر مختصر نوشتے آٹھ جلدوں میں شائع کیے جائیں گے۔

سارا مواد بڑی دیدہ ریزی اور مشقت کے ساتھ سلیس زبان اور دلنشیں پیرایے میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایسی کاوش ہے جو آئندہ کئی نسلوں کو علم و دانش سے مالا مال کرتی رہے گی۔ ادیبوں، صحافیوں، طلبہ اور علم دوست قارئین کے لیے ایک نادر تحفہ، ہر جلد اپنے آپ میں مکمل ہے۔

جلد اوّل، 578 صفحات، قیمت -/300 روپے۔ جلد دوم، 568 صفحات، قیمت -/450 روپے۔ جلد سوم، 614 صفحات، قیمت -/450 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

حبیب الرحمان چغانی

تنظیمِ کتب خانہ میں کمپیوٹر

کمپیوٹر کی ایجاد کیا ہوئی، ایک انقلاب آگیا۔ حساب کتاب کا معاملہ ہو یا علم و ادب کا، سائنس ہو یا مذہب، صحافت ہو یا کتابت، ٹیکنالوجی ہو یا فن کاری، سیاست ہو یا عسکریت، غرض کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں جو اس کی دسترس سے باہر ہو۔ آیئے ہم ذرا یہ دیکھیں کہ ہندستانی کتب خانوں میں کمپیوٹر کا اثر ورسوخ اور استعمال و اطلاق کس حد تک ہوا ہے۔

کتب خانے کا بنیادی مقصد اپنے قارئین کی ضرورتوں کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس کے دامن میں علم و آگہی کے جو گوہر آب دار ہیں انھیں پیش کرے بلکہ ان سے مطلوبہ مواد بھی حاصل کرکے فراہم کرنے کی کوشش کرے۔ کتب خانے کئی طرح کے ہوتے ہیں اس لیے ان کے مقاصد کا تعین بھی ان کی نوعیت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ مثلاً عوامی کتب خانوں کے قارئین کی ضرورتیں علمی اداروں کے کتب خانوں کے قارئین سے مختلف ہوتی ہیں۔ تاہم ان میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ ان کی تنظیم (Organisation) یا انتظامی تنظیم (Administrative Organisation) ہے۔ لائبریری جتنی بہتر طریقے پر منظم ہوگی، اتنی ہی بہتر اس کی کارکردگی ہوگی۔ عام طور پر لائبریری میں دو طرح کی خدمات انجام دی جاتی ہیں۔ ایک تکنیکی، دوسری قارئین کی خدمات۔ اوّل الذکر پس پردہ ہوتی ہیں اور ان کا براہِ راست کوئی تعلق قارئین سے نہیں ہوتا، تاہم ان دونوں میں گہرا ربط ہے۔ مؤخر الذکر کی بہتری کا دارومدار اوّل الذکر کی بہتری پر ہوتا ہے۔ جہاں تکنیکی خدمات کا اختتام ہوتا ہے، وہیں سے قارئین کی خدمات کا آغاز ہوتا ہے۔

انتخابِ کتب سے لے کر شیلف پر ترتیبِ کتب تک تمام مراحل تکنیکی خدمات کے ذیل میں آتے ہیں۔ (یہاں لفظ کتاب کا استعمال وسیع معنی میں ہوا ہے۔ اس میں رسائل وغیرہ کے علاوہ سمعی بصری مواد بھی شامل ہے)۔ حصولِ کتب کے تین طریقے ہیں: خرید، عطیہ اور مبادلہ۔ کتابیں خواہ کسی طریقے سے بھی حاصل کی جائیں، ان کا اندراج ایک رجسٹر میں کتاب کی جملہ تفصیلات کے ساتھ نمبر شمار کے تحت کیا جاتا ہے۔ اسے داخلہ رجسٹر (Accession Register) کہتے ہیں۔ یہ ایک دفتری ریکارڈ ہوتا ہے جس کا استعمال لائبریری اسٹاف مخصوص حالات میں کرتا ہے۔ بڑے کتب خانوں میں آسانی کے لیے خرید اور عطیات کے داخلہ رجسٹر الگ ترتیب دیے جاتے ہیں۔

اس کے بعد کا مرحلہ بہت اہم اور مشکل ہوتا ہے جسے ہم درجہ بندی (Classification) اور فہرست سازی (Cataloguing) کے نام سے جانتے ہیں۔ درجہ بندی کی مختلف رائج اسکیموں کی مدد سے کتابوں کے موضوعات کو درجہ نمبر (Class No.) دیے جاتے ہیں تاکہ لائبریری میں ایک موضوع کی تمام کتابیں یکجا ہو جائیں۔ پھر ایک ہی موضوع کی کتابوں کی مزید نشاندہی مصنف یا کتاب نمبر سے کی جاتی ہے۔ اس طرح کسی خاص موضوع پر کسی مخصوص مصنف کی کتاب کو آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ کسی بھی کتاب تک رسائی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی صحیح جگہ کا علم ہو۔ کبھی ہمیں مصنف کا علم ہوتا ہے تو کبھی عنوان کا، کبھی دونوں سے واقف ہوتے ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے جب ہم دونوں سے بے خبر ہوتے ہیں، صرف موضوع کا علم ہوتا ہے۔ ان تمام صورتوں میں مطلوبہ کتابوں کو تلاش کرنے کے لیے مختلف فہرستیں ہماری مدد کرتی ہیں۔ فہرست (Catalogue) لائبریری ذخائر کی کلید ہوتی ہے۔ یہ ایک جامِ جم ہے جس میں لائبریری میں موجود تمام کتابوں کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اچھے کیٹلاگ کی خوبی یہ ہے کہ قاری اپنی مطلوبہ کتاب کو جس طرح چاہے، ڈھونڈ لے، خواہ مصنف کے حوالے سے (یہاں ہم نے مصنف کے تحت مشترک مصنف، مرتب، مترجم وغیرہ کو بھی شامل کر لیا ہے) خواہ عنوان، موضوع یا سلسلے (Series) کے حوالے سے۔ فہرست میں کتاب کی جملہ تفصیلات کے علاوہ طلبی نمبر (Call No.) بھی درج ہوتا ہے جس کے تحت کتاب شیلف پر رکھی جاتی ہے۔ کیٹلاگ کی خارجی شکل (Physical Form) کئی طرح کی ہے۔ ان سب میں کارڈ کیٹلاگ مقبول عام ہے۔ جب مصنف، عنوان، موضوع اور سلسلے وغیرہ کے کارڈوں کو الفبائی ترتیب کے ساتھ ایک ہی سلسلے میں ضم کر دیا جاتا ہے تو اسے لغوی فہرست (Dictionary Catalogue) کہتے ہیں۔ یہ کیٹلاگ کی داخلی شکل (Inner Form) سے موسوم کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کیٹلاگ کی دوسری داخلی شکلیں بھی ہیں لیکن ہم نے صرف اس شکل کا ذکر کیا ہے جسے قبولِ عام حاصل ہے۔ یہ کیٹلاگ ہی قاری اور کتاب کے درمیان ایک وسیلہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ شیلف لسٹ بھی تیار کی جاتی ہے۔ جسے Official Catalogue کہا جاتا ہے۔ اس میں کارڈوں کی ترتیب وہی ہوتی ہے جو شیلف پر کتابوں کی ترتیب ہوتی ہے۔ اس میں داخلہ نمبر کا بھی اضافہ ہوتا

ہے۔ اس کا استعمال لائبریری اسٹاف تنقیح (Stock taking) کے وقت کرتا ہے۔ درجہ بندی اور فہرست سازی کے لیے تجربہ کار فہرست سازوں (Cataloguers) کی ضرورت ہوتی ہے۔ کتابوں کے موضوعات کو متعین کرنا، ان کا صحیح نمبر طے کرنا اور یہ طے کرنا کہ مصنف کے نام کے کس حصے کو اوّلیت دی جائے، خاصا دماغ سوزی کا کام ہے۔ اس کے علاوہ کتاب پر لیبل اور ڈیٹ سلپ چسپاں کرنا، ان پر طلبی نمبر لکھنا اور بک کارڈ بنانا ایک نیم فنی کام ہے۔ جب یہ تمام کارروائیاں مکمل ہوجاتی ہیں تو کتاب کو شیلف پر مخصوص جگہ پر رکھ دیا جاتا ہے۔ اسی اثنا میں کارڈ بھی کیٹلاگ کیبنٹ میں ترتیب سے لگا دیے جاتے ہیں۔ اگر کارڈ کی ترتیب میں غلطی ہوجائے یا کتاب کے لیبل پر غلط نمبر لکھ دیا جائے یا صحیح نمبر کے باوجود شیلف پر کتاب کی ترتیب میں سہو ہوجائے تو ان کی بازیافت ممکن نہیں۔ پھر ان کا ملنا محض اتفاق ہوتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ غلط جگہ پر رکھی ہوئی کتاب کو گم شدہ سمجھنا چاہیے۔

ہمارے ملک میں یہ ساری تکنیکی کارروائی (Technical Processing) عام طور پر ہاتھ سے ہوتی رہی ہے یا ٹائپ رائٹر کا استعمال ہوتا ہے۔ ایک کتاب کے کئی کئی کارڈ بنتے ہیں تو بار بار انھیں مخصوص اضافے (مشترک مصنف، مرتب، مترجم، عنوان، موضوع اور سلسلہ وغیرہ) کے ساتھ ٹائپ کرنا پڑتا ہے۔ کارڈ ڈپلی کیٹر بھی ہر جگہ دستیاب نہیں۔ لہٰذا اس تکثیری عمل (Multiplication) میں غلطی کا امکان بہت بڑھ جاتا ہے۔ صرف خاص اندراج (Main Entry) پر نظر ثانی کرلی جاتی ہے اور وقت بچانے کی خاطر باقی اندراجات کو اس امید پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ صحیح ہوں گے جب کہ حقیقتاً ایسا نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی یہ ستم بھی ہوتا ہے کہ زاید اندراجات (Added Entries) میں اضافی معلومات، (Additional Information) مثلاً عنوان، موضوع اور سلسلہ وغیرہ بھی نظر ثانی سے محروم رہ جاتی ہیں۔ اندراجی لفظ (Entry Word) کا املا اگر غلط ہوجائے تو اس کی تہجی ترتیب بدل جائے گی اور اس کارڈ کی تلاش ناممکن ہوجائے گی۔ جب کتابیں شیلف پر پہنچ جاتی ہیں تو قارئین کی خدمات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اگر لائبریری میں آزادانہ داخلہ (Open Access) ہے تو قارئین شیلف پر بھی کتاب کی ورق گردانی (Browsing) کرسکتے ہیں، دارالمطالعے میں ان کا استعمال کرسکتے ہیں یا پھر عارضی طور پر انھیں مستعار (Borrow) لے لیتے ہیں۔

شعبۂ اجرا (Circulation Section) سے کتابیں ایشو کی جاتی ہیں۔ کتابیں ایشو کرنے کے لیے ایسا اجرائی نظام (Discharging System) اختیار کرنا چاہیے جس میں قاری کا وقت کم سے کم صرف ہو۔ اس کے علاوہ شعبۂ حوالہ (Reference Section) سے مطلوبہ معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ یہ تفصیل دینا اس لیے ضروری تھی تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ کمپیوٹر کے نفاذ سے ان سب کاموں میں کہاں تک مدد مل سکتی ہے۔

مناسب ہوگا کہ پہلے کمپیوٹر کی عام خصوصیات پر ایک نگاہ ڈالی جائے۔

1-رفتار (Speed): اس کی رفتار ناقابلِ یقین حد تک تیز ہوتی ہے۔ ایک طاقتور کمپیوٹر ایک سیکنڈ میں تقریباً تیس لاکھ تک کی گنتی کرسکتا ہے۔ اس کی تیز رفتاری کی وجہ سے ہی خلائی تجربے ممکن ہوسکے۔ اس کی تیز رفتاری کا اندازہ ایک مثال سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ Thomas Aquinas کی کل تصانیف (جن میں تقریباً ایک کروڑ تیس لاکھ الفاظ ہیں) کا اشاریہ اگر ہاتھ سے بنایا جائے تو پچاس عالموں کو تقریباً چالیس برس اس کی تکمیل میں لگ جائیں گے جب کہ کمپیوٹر کی مدد سے چند عالموں نے اسے ایک سال کی مدت سے کم میں مکمل کر ڈالا۔ 2- ذخیرہ کاری (Storage): کمپیوٹر کے CPU (Central Processing Unit) کے داخلی حافظے کی ایک انتہا ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرسکتا۔ ہر چند کہ یہ انسانی ذہن سے بدرجہا وسیع ہے تاہم یہ ممکن نہیں کہ دنیا کی ہر شے اس میں سما جائے۔ لیکن CPU کے باہر ذخیرہ کاری کے ذیلی (Auxiliary) یا ثانوی (Secondary) آلات (Devices) مثلاً Magnetic Tape, Magnetic disc اور Floppy disc وغیرہ میں دنیا بھر کی معلومات کو محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ 3- درستی (Accuracy): مشین سے بھی غلطیاں ہوسکتی ہیں لیکن اس میں غلطی پکڑنے کے ایسے کارگر طریقے ہوتے ہیں کہ شاذونادر ہی غلط نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ جو غلطیاں ہوتی بھی ہیں، ان کا سبب عموماً ٹیکنالوجیائی کوتاہیاں نہیں، انسانی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ 4- ہمہ گیریت (Versatility): بظاہر کمپیوٹر کے ذریعے ہر کام ممکن ہوگیا ہے بشرطیکہ اسے منطقی مرحلوں کے سلسلے میں اختصار سے منتقل کیا جاسکے۔ اپنی محدود صلاحیت کے باوجود کمپیوٹر یہ چار کام بخوبی انجام دیتا ہے: 1- یہ بیرونی دنیا کے ساتھ (Input / Output) I/O طریقوں کے ذریعے معلومات کا مبادلہ کرتا ہے۔ 2- یہ CPU کے اندر معلومات منتقل کرتا ہے۔ 3- یہ ریاضی کے بنیادی کاموں کو انجام دیتا ہے۔ 4- یہ تقابل کے کاموں کو بھی انجام دیتا ہے۔ 5 - خود کاریت (Automation): کمپیوٹر کے حافظے میں اگر کوئی پروگرام ڈال دیا گیا ہے تو وہ مطلوبہ کام کو محض ایک ہدایت پر اس وقت تک جاری رکھے گا جب تک کہ وہ مکمل نہ ہوجائے۔ بار بار ہدایت دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ 6- جفاکشی (Diligence): اس پر انسانوں کے برعکس، تکان کا اثر نہیں ہوتا۔ مسلسل کئی گھنٹوں کے استعمال کے باوجود کام کی کوالٹی متاثر نہیں ہوتی۔ انسان جب تھک جاتا ہے تو اس کے کام کا معیار گر جاتا ہے۔

لائبریری میں کمپیوٹر کے استعمال سے نہ صرف انسانی کمزوریوں پر قابو پایا جاسکتا ہے بلکہ کام کی رفتار بھی غیر معمولی حد تک تیز ہوجاتی ہے۔ اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ عملے کی مطلوبہ تعداد میں نمایاں تخفیف ہوجاتی ہے۔ تکنیکی خدمات جو پہلے مذکور ہوچکی ہیں کمپیوٹر کے ذریعے بحسن وخوبی انجام دی جاسکتی ہیں۔ اگر کسی معتبر Integrated Library Software کا استعمال کیا جائے تو کتابوں کا آرڈر دینے کے مرحلے پر ہی ان کی تفصیلات (جو عموماً ناشرین کی فہرستوں کی بنیاد پر ہوتی ہیں) کمپیوٹر کے حافظے میں داخل کردی جاتی ہیں۔ جب کتابیں لائبریری میں موصول ہوجاتی ہیں تو ان کی تفصیلات میں متعلقہ کتابوں کی بنیاد پر حسب ضرورت تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ Data دوبارہ Feed کرنا نہیں ہوگا۔ کیٹلاگنگ کے مرحلے میں اسی اندراج میں (Anglo-American Cataloguing Rules II) AACRII کے مطابق مزید اضافے (Upgrade) کیے جاسکتے ہیں نیز طلبی نمبر اور زاید اندراجات میں صرف مصنف، عنوان، موضوع اور سلسلے وغیرہ سے متعلق مطلوبہ معلومات کا ہی اضافہ کرنا ہوگا۔ یہ اضافے کرنے سے پہلے خاص اندراج کی تصحیح بے حد ضروری ہے۔ اس طرح OPAC (Online Public Access Catalogue) تیار ہوجائے گا جسے ہر اعتبار سے کارڈ کیٹلاگ پر فوقیت حاصل ہے۔

اگر Library of Congress Subject Headings کی فلاپی کو کمپیوٹر میں فیڈ کردیا جائے تو انگلی کی ایک ہلکی سی جنبش سے متعلقہ موضوعی عنوان/عنوانات خاص اندراج میں منتقل ہوسکتے ہیں۔ اس طرح فہرست ساز LCSH کی بڑی بڑی جلدوں کو دیکھنے کی زحمت سے بچ جائے گا۔ مزید برآں مختلف اشاریے اور موضوعی کتابیات کی تدوین بہت آسان ہوجائے گی۔

'دیکھیے' (See) اور 'مزید دیکھیے' (See also) حوالے (References) دینے سے بہت سی آسانیاں ہوجاتی ہیں۔ ان کی ضرورت مصنف، عنوان اور موضوع ہر اندراج میں ہوتی ہے۔ یہ حوالے عام بھی ہوسکتے ہیں اور خاص بھی یعنی کسی مخصوص اندراج سے متعلق۔ اپنی ضرورت کو مدِنظر رکھتے ہوئے انھیں داخلِ حافظہ کرنا ہوگا۔ اگر علم کتاب خانہ کے قوانین خمسہ (Five laws) کو ملحوظ رکھا جائے تو تکنیکی اور قارئین کی خدمات بہت جامع (Exhaustive)، سریع (Expeditious) اور بالکل صحیح (Pin Pointed) ہوسکتی ہیں۔ یہ قوانینِ خمسہ ہیں: 1- کتابیں استعمال کے لیے ہیں، یعنی کتابوں کا بنیادی مقصد تحفظ نہیں، استعمال ہے۔ لیکن استعمال کے لیے تحفظ ضروری ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کتب خانے کے تمام ذخائر کا علم قارئین کو ہو۔ OPAC اس کے لیے بہترین ذریعہ ہوسکتا ہے۔ 2- ہر قاری کو اس کی مطلوبہ کتاب ملنی چاہیے۔ 3- ہر کتاب کو قاری فراہم کرنا چاہیے۔

عام طور پر قانونِ دوم کو پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر قانونِ سوم کا خیال بھی نہیں آتا ہے۔ ہر لائبریری میں ایسی کتابیں ہوتی ہیں جن کا کبھی استعمال ہی نہیں ہوا ہے۔ لائبریری اسٹاف کی یہ ذمے داری ہے کہ ایسی کتابوں کو متعلقہ قارئین کے علم میں لائے تاکہ قانونِ اول پر عمل ہوجائے اور کتابوں کو حرماں نصیبی کا شکوہ بھی نہ رہے۔ OPAC سے موضوعی فہرستوں کے Printouts حاصل کرکے متعلقہ شعبوں کو روانہ کردینا چاہئیں نیز ایسی کتابوں کی موضوعی اعتبار سے گاہے گاہے لائبریری میں نمائش کرتے رہنا چاہیے۔ 4- قاری کا وقت بچانا چاہیے۔ جتنی بہتر لائبریری کی تنظیم ہوگی، قارئین کا اتنا ہی کم وقت صرف ہوگا۔ کتاب ایشو کرنے، اسے واپس لینے اور کتاب کی مدت مطالعہ میں توسیع کرنے میں کم سے کم وقت لگنا چاہیے۔ کمپیوٹر کے ذریعے یہ کام بہتر طریقے پر انجام دیا جاسکتا ہے۔ 5- لائبریری ایک نامیاتی ادارہ ہے۔ لائبریری میں ہمہ جہت ترقی ہوتے رہنا چاہیے۔ غیر مطلوبہ کتابوں کا اخراج اور ضروری کتابوں کا داخلہ اس کی بقا کا ضامن ہے۔ کتاب خانہ جتنا فعال اور مؤثر ہوگا اتنا ہی قارئین کے لیے اطمینان کا باعث ہوگا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ لائبریری کا مقصد اپنے قارئین کو ہر اعتبار سے مطمئن کرنا ہوتا ہے تو یہ بھی لازم ہے کہ تکنیکی خدمات پر خصوصی توجہ دی جائے۔ قارئین کمپیوٹر کی مدد سے کتاب کے بارے میں ہر طرح کی معلومات حاصل کرسکتے ہیں اور وقت بھی زیادہ صرف نہیں ہوتا۔ کارڈ کیٹلاگ میں ایک ایک کرکے کارڈ پلٹنے پڑتے ہیں تب ہمیں مطلوبہ معلومات حاصل ہوپاتی ہیں جب کہ کمپیوٹر کے ذریعے ایک ہی بار میں پردے پر بیس پچیس اندراجات نظر آجاتے ہیں اور مطلوبہ کتاب کو فوراً ہی تلاش کرلیا جاتا ہے۔ پھر ایک اور فائدہ بھی اس سے حاصل کیا جاسکتا ہے جو کارڈ کیٹلاگ سے ممکن نہیں۔ اگر کوئی عنوان کئی الفاظ پر مشتمل ہے تو صرف پہلے لفظ ہی کے نہیں بلکہ کسی بھی لفظ جو ہجّی ترتیب میں کہیں وارد ہوا ہو، ابتدائی تین حروف کو ٹائپ کرنے سے مطلوبہ کتاب مل جائے گی۔ بالفاظ دیگر مختصر ترین معلومات (Truncated Information) سے بھی بازیافت ممکن ہے۔

کبھی کبھی یہ بھی مشاہدے میں آتا ہے کہ کوئی نامعقول قاری کتاب نہ ملنے پر اپنے غصے کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ کیٹلاگ سے نہ صرف متعلقہ کارڈ بلکہ چند دیگر کارڈ بھی غائب کردیتا ہے اور کبھی محض شرارتاً ایسا کرتا ہے۔ OPAC میں یہ تحریف ممکن نہیں کیوں کہ قارئین کے استعمال کے لیے Dumb Terminals فراہم کیے جاتے ہیں۔ اگر Computer Net working درسی شعبہ جات تک کردی جائے تو معلومات حاصل کرنے کے لیے لائبریری آنا بھی ضروری نہیں۔ یہ کام وہیں سے کیا جاسکتا ہے۔ انٹرنیٹ نے یہ محاورہ غلط ثابت کردیا ہے کہ پیاسے کو کنویں تک آنا پڑتا ہے بلکہ اب تو

کنواں خود پیاسے کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

لائبریری کی کمپیوٹر کاری میں بے شمار فوائد مضمر ہیں۔ ہر لائبریری یہ چاہتی ہے کہ کمپیوٹر کا استعمال کرے تاکہ اس گنجینۂ علم سے لوگ زیادہ سے زیادہ استفادہ کرسکیں۔ لیکن اس پر عمل نہیں ہو پاتا ہے۔ خاص کر جامعاتی کتاب خانوں میں کمپیوٹر کا استعمال یا تو محدود پیمانے پر کیا گیا ہے یا سرے سے ہوا ہی نہیں ہے۔ اس کے وجوہ معلوم کرنے سے پہلے ان کی تنظیم پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ ہمارے سامنے اس وقت قدیم جامعات کے کتاب خانے ہیں جن کے مخصوص مسائل کمپیوٹر کاری میں کسی حد تک خارج ہوسکتے ہیں یا اسے دشوار بنا دیتے ہیں۔ فہرست سازی ایک تکنیک یا ایک فن ہے۔ اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ فہرست نگاری کے اصولوں سے چشم پوشی کی گئی اور قدم قدم پر مقامی انحراف و اختلاف (Local Deviation/Variation) کے اصول کا سہارا لیا گیا۔ لہٰذا کوئی معیار قائم نہ رہ سکا۔ اگر کسی ایک ہی لائبریری کے کیٹلاگ کارڈوں کا جائزہ لیا جائے تو مختلف اوقات میں اندراجات مختلف انداز میں کیے گئے ہیں۔ کتابی تفصیل ابتدا میں بہت مختصر ہوتی تھی، بعد ازاں اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس میں مقامی انحراف کے علاوہ کلاسی فیکیشن اسکیموں اور کیٹلاگنگ رولز کے نئے ایڈیشنوں کی بھی کارفرمائی شامل ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہو کہ کیٹلاگ کارڈ اختلافات کا مظہر ہوں اور کمپیوٹر کاری کے لیے بنیاد شیلف لسٹ ٹھہرے تو اس کا انجام تو ظاہر ہے جو ہوگا۔ ساتھ ہی کیٹلاگ بے اصولی اور پراگندگی کا ملغوبہ (Mess) ہوکر رہ جائے گا اور کیٹلاگ کا جو اصل مقصد ہے وہ فوت ہوجائے گا۔

یہ فسانہ نہیں حقیقت ہے۔ دہلی میں کسی مرد دانا نے ایک شوشہ چھوڑا کہ جو لوگ ٹائپ جانتے ہیں، وہ بآسانی شیلف لسٹ کی مدد سے Data Input کرسکتے ہیں اور فی اندراج صرف ڈھائی روپے صرف ہوگا۔ اس طرح آن لائن کیٹلاگ قلیل صرفے پر تیار ہوجائے گا۔ دہلی میں اس پر عمل بھی ہوا۔ یہ خبر ہوا کے دوش پر علی گڑھ پہنچی، یہاں بھی اسے آزمایا گیا۔ اس کا جو انجام ہونا تھا، ہوا۔ کیٹلاگ تو نہ بن سکا البتہ وقت اور پیسہ ضائع ہوا۔ دہلی کی ایک یونیورسٹی نے اپنی لائبریری کو کمپیوٹرائزڈ کرانے کے لیے کسی تجارتی کمپنی کے سپرد یہ کام کیا۔ آسانی کی خاطر اس نے بھی شیلف لسٹ کے ڈاٹا کو فیڈ کیا۔ جب اس کے نقائص سامنے آئے تو اسے منسوخ کرنا پڑا۔ سنا ہے اس نے فی کتاب 23/22 روپے لیے۔ اب ہر کتاب کو سامنے رکھ کر اس کی درجہ بندی اور فہرست سازی کی جارہی ہے۔ یہاں یہ بتانا بھی مناسب ہوگا کہ جب میں خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری میں تھا تو سینٹرل سکریٹریٹ لائبریری، دہلی (جو وزارتِ فروغ انسانی وسائل کے تحت آتی ہے) نے اطلاع دی تھی کہ ایک کتاب کی مکمل Processing کے لیے حکومت نے مبلغ چالیس روپے طے کیے ہیں۔ خدابخش لائبریری کے کچھ مخصوص مسائل ہیں، اس لیے مختلف ایجنسیوں سے رابطہ کیا گیا۔ DELNET کے ڈائرکٹر ڈاکٹر کول نے خود لائبریری کا معائنہ کیا اور معاوضہ فی کتاب پچاس روپے کی شرح سے طلب کیا۔ یہ داستان سرائی محض اس لیے کی گئی کہ لائبریری کی کمپیوٹر کاری میں جو مسائل درپیش ہوتے ہیں ان کا بخوبی علم ہوجائے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کمپیوٹر کاری کا ارادہ ترک کردیا جائے۔

تجارتی ایجنسیاں تو ایک متعینہ تاریخ (Cut off Date) سے پہلے کے ذخیرے کی کمپیوٹر کاری کی ذمے دار ہوں گی۔ اس کے بعد مسلسل آنے والی کتابوں کی Processing لائبریری کا مقررہ عملہ ہی انجام دے گا۔ لہٰذا کسی اچھے Library Software کی ضرورت ہوگی۔ آج کل Libsys کا بہت ذکر کیا جارہا ہے۔ اس کی قیمت ساڑھے تین چار لاکھ روپیوں کے درمیان ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی اور بہتر اور کم قیمت سوفٹ ویئر دستیاب ہے تو اسے حاصل کرنا ہوگا۔ اس سوفٹ ویئر کے استعمال سے اردو کتابوں کی فہرست سازی کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اردو زبان کے سوفٹ ویئر تو بہت ملتے ہیں لیکن ان سے ہمارا مسئلہ حل نہیں ہوتا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اردو زبان کے فروغ اور کمپیوٹر تعلیم کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دے رہی ہے وہ قابلِ ستائش ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس کے ایجنڈے میں اردو لائبریری سوفٹ ویئر بھی ہوگا۔

ایسے کتب خانوں میں، جیسے مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری، دہلی، خدابخش لائبریری، پٹنہ اور رام پور رضا لائبریری وغیرہ میں جہاں اردو، فارسی اور عربی زبانوں میں بے شمار کتابیں موجود ہیں، کمپیوٹر کے نفاذ کے باوجود تمام ذخائر کا آن لائن کیٹلاگ مرتب نہیں ہوسکے گا۔ ان کا تحفظ اور ابلاغ خصوصی توجہ کا محتاج ہے۔ فارسی اور عربی زبانوں میں ہمارا تہذیبی، تاریخی، سیاسی، مذہبی، ادبی اور علمی سرمایہ محفوظ ہے۔ اگر ان کتابوں اور مخطوطوں کے تحفظ کا مناسب انتظام نہیں کیا گیا تو ہم اس ورثے سے محروم ہوجائیں گے۔ حکومت کے منصوبوں میں قومی سطح پر مخطوطات کی فہرست سازی شامل ہے۔ اگر اردو کتابیں بھی اس پروگرام میں شامل کرلی جائیں تو اس متاعِ نایاب سے استفادے کی صورت پیدا ہوجائے گی اور اگر کمپیوٹر کا اطلاق ان بیش بہا ذخائر پر ہوجائے تو دونوں مسئلے حل ہوسکتے ہیں، یعنی فلاپی کی شکل میں تمام محتویات کو محفوظ کیا جاسکتا ہے اور ان کا استعمال بھی آسان ہوجائے گا۔

□□□

Hareem, Tameer-e-Millat Road, Dodh Pur,
Civil Lines. Aligarh-202002 (U.P.)

فضیل احمد خاں

عورتوں کے تئیں دوہرا رویّہ

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

عورت کبھی ہمارے سماج میں وہ مقام حاصل نہیں کر سکی، جس کی وہ مستحق ہے۔ مندروں میں ہم نے اس کے سامنے دیے ضرور جلائے لیکن اس کے زندہ ستی ہو جانے پر مدتوں ہماری پیشانی پر شکن بھی نہیں آئی۔ اس کو ہم نے انسانیت کا جنم داتا ضرور مانا لیکن اسے سرِ بازار بیچنے میں کبھی ہمیں غیرت نہیں آئی۔ ہم نے اس کو گھر کی لکشمی اور گھر کی زینت ضرور کہا لیکن کوٹھوں پر اس کے پیر میں گھنگھرو باندھ کر نچانے میں کبھی ہمیں شرم نہیں آئی۔ عورت کی گود کو ہم نے انسانیت کی پہلی تربیت گاہ ضرور کہا لیکن اسے مقدس وید کے اشلوک سننے کی اجازت ہم نے نہیں دی۔

عورت کے تئیں ہمارا یہ پرانا اور گھناؤنا رویّہ آج بھی کسی نہ کسی صورت میں ہمارے سماج میں زندہ ہے۔ آج بھی لڑکیوں کی پیدائش کے ذرسے اسقاطِ حمل کرایا جاتا ہے، لڑکی کی پیدائش کو آج بھی نحس مانا جاتا ہے، اسے جنم دینے پر آج بھی ماؤں کو سزا بھگتنی پڑتی ہے اور جہیز کے خلاف حکومت کے سخت قانون کے باوجود 90فی صد لڑکیوں کو جہیز کی مانگ سے دوچار ہونا پڑتا ہے، جس کے لیے ہمارا سماج پورے طور پر ذمّے دار ہے۔ ہم عورتوں کے خلاف جرائم کی روک تھام میں حکومت کو پورا تعاون نہیں دیتے جب کہ حکومت صرف انھی معاملات میں دخل اندازی کر سکتی ہے، جن کی اطلاع اسے دی جائے۔ بعض علاقوں میں تو سماجی اور تعلیمی حیثیت کے مطابق لڑکوں کی قیمت متعین کر دی گئی ہے۔ عورتوں کے تئیں دوہرے رویّے کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ 1951 میں جب ہندستان سماجی و تعلیمی طور پر زیادہ پسماندہ تھا، ایک ہزار لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کا تناسب 946 تھا۔ یعنی ہر ایک ہزار پر لڑکوں کے مقابلے میں 54 لڑکیاں کم تھیں۔ 1999 میں یہ تناسب، سماجی سوجھ بوجھ کی وجہ سے بڑھنے کے بجائے اور گھٹ گیا اور ایک ہزار لڑکوں کے مقابلے میں صرف 930 لڑکیاں رہ گئیں۔ لڑکیوں کے لیے ماقبلِ پیدائش، مابعدِ پیدائش (Pre-natal, Post-natal Health Care)، پرورش میں تعاون اور صحی دیکھ بھال جیسے حکومت کے پروگراموں پر آج ایک سوالیہ نشان لگا ہوا ہے۔ تکنیکی ترقی کی وجہ سے لڑکیوں کے خلاف تعصب مزید جارحیت اختیار کرتا جا رہا ہے کیونکہ جدید ترقی یافتہ سائنسی تکنیک کی وجہ سے رحمِ مادر میں ہی بچے کی جنس کا پتہ کر کے ایک بڑے پیمانے پر بچیوں کو قتل (Female Foeticide) کیا جا رہا ہے۔

بیسویں صدی میں جب آزادی کا سورج آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا تھا اور اس کے چہرے سے غلامی کے بادل ہٹ رہے تھے تو تاریخ کی اسی مبارک گھڑی میں پابندیوں کے بوجھ کے نیچے سسکتی ہوئی عورت بھی اپنی کھوئی ہوئی ہمت کو دوبارہ یک جا کر رہی تھی تا کہ غلامی کی اس زنجیر کو توڑ پھینکے جس میں وہ صدیوں سے جکڑی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ اس نے اس راہ میں انتھک کوششیں کیں لیکن اس کو جزوی کامیابیاں ہی ملیں۔ اس نے کھیل کود کے میدان میں بلند مقام حاصل کیا۔ موسیقی اور تھیٹر کی دنیا میں مردوں سے برابری کے دعوے کو عملاً ثابت کر دکھایا۔ اس نے آفسوں میں کام کرنا شروع کر دیا اور بڑے بڑے منصوبوں کو بخوبی انجام دے کر یہ ثابت کر دیا کہ عورت ہر اس کام کو انجام دے سکتی ہے، جس پر مرد آج تک اپنی اجارہ داری کا دعوا کرتے آئے ہیں۔

عورتوں کی تعلیمی اور ذہنی ترقی کے باوجود ان کے ساتھ دوہرا رویّہ اور غیر مساویانہ برتاؤ آج بھی کچھ کم نہیں ہے۔ مثال کے طور پر تعلیم کے میدان میں لڑکیوں کی بہترین کارکردگی کے باوجود ان کا تناسب لڑکوں کے مقابلے میں کافی کم ہے۔ لوگ اپنی لڑکیوں کے لیے تعلیم کی ویسی سہولیات فراہم نہیں کرتے جیسی وہ لڑکوں کے لیے کرتے ہیں۔ مزید برآں ہمارے سماج کا ایک بڑا طبقہ لڑکیوں کو اعلا تعلیم دلانے کے سلسلے میں آج بھی پس و پیش میں ہے یا پھر وہ سرے سے اس بات کو مانتا ہی نہیں کہ لڑکیوں کو بھی اعلا تعلیم دینا چاہیے۔ ہم اس کے لیے والدین کی پسماندہ ذہنیت کو ذمّے دار ٹھہرا سکتے ہیں لیکن بہت حد تک اس کے لیے ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم بھی ذمّے دار ہے جو مشرقی اقدار پر خاطر خواہ توجہ نہیں دیتا جس کی توقع والدین بطورِ خاص اپنی بچیوں کے لیے کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نظامِ تعلیم میں (جس کو میکالے Mecaulay نے 1935 میں نوآبادیاتی حکومت کے مفاد کے پیشِ نظر تیار کیا تھا) مشرقی اقدار اور ہندستانی تہذیب کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔ بڑے برانڈ کی پروڈکٹس سے لے کر تمبا کو کے ایک چھوٹے سے پاؤچ تک ہر چیز پر عورتوں کی نیم برہنہ تصویریں چھاپی جا رہی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ جدید مارکیٹنگ نظام عورتوں کو ایک جنس کے طور پر بازار میں پیش کرنے پر تلا ہوا ہے۔ آخر وہ حکومتی یا غیر حکومتی تنظیمیں جنھوں نے عورتوں کی فلاح و بہبود کا بیڑا اٹھا رکھا ہے، کیوں آگے نہیں بڑھتیں اور ان باتوں کی طرف کیوں توجہ نہیں دیتیں؟

موجودہ حالات میں عورتوں کے اندر سیاسی و سماجی بیداری پیدا کرنے کی ضرورت اور بڑھ گئی ہے تا کہ وہ خود اپنے استحصال کے خلاف آواز اٹھا سکیں اور ملک کی ترقی میں اپنا تعاون دے سکیں۔ ضرورت ہے کہ منصوبہ بند طریقے سے

عورتوں کے اندر سیاسی و سماجی بیداری پیدا کی جائے اور انھیں ان کے سیاسی و سماجی حقوق وفرائض سے روشناس کرایا جائے تاکہ بوقتِ ضرورت وہ اپنے حقوق کا مطالبہ کرسکیں اور بہتر طور پر اپنے فرائض انجام دے سکیں۔ محض ریزرویشن عورتوں کی ترقی کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ کیوں کہ جب تک وہ اپنے حقوق اور فرائض سے بخوبی آگاہ نہیں ہوں گی اس وقت تک ان کے اختیارات کا استعمال بہت حد تک مردوں ہی کے ہاتھوں ہوگا جو کہ بسااوقات افسردگی کا سبب بن جاتا ہے اور نفسیاتی طور پر وہ مزید پیچھے چلی جاتی ہیں۔ اس کی واضح مثال ان علاقوں کے حالات ہیں جہاں پردھانی وغیرہ کے انتخابات میں عورتوں کی نشستیں محفوظ کردی گئی ہیں لیکن انھیں ان کے منصب کی اہمیت وفرائض سے بخوبی واقف نہیں کرایا گیا ہے۔

مردوں کے جارحانہ رویے، سماجی استحصال، معاشی بحران اور خصوصاً سیاسی نظام کی ابتری نے آج عورتوں کو جرائم کی دنیا تک کھینچ لیا ہے اور جرائم میں ان کی حصے داری تشویشناک حد تک بڑھتی جارہی ہے۔ ہم یہ نہیں سوچتے کہ اگر عورت، جس کی گود انسانیت کی پہلی تربیت گاہ ہے، جہاں انسان پہلی بار آنکھیں کھولتا ہے اور جہاں پیار کی لوریاں سنتا ہے، جرائم میں ملوث ہوگئی اور اس کے ہاتھوں میں بندوق اور گرینیڈ تھما دیا گیا تو دنیا کے لیے کتنا بڑا خطرہ پیدا ہوجائے گا اور ہمارا مستقبل کس قدر غیر یقینی ہوجائے گا۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ عورت اگر صالح اور شریف شہری پیدا کرسکتی ہے تو مجرم، دہشت گرد اور سماج دشمن عناصر کو بھی جنم دے سکتی ہے۔

آج عورتوں کو یہ احساس دلانے کی ضرورت ہے کہ سماج کی تعمیر و ترقی میں ان کا کردار کس قدر اہم ہے۔ ادھورے سماج کو وہ کس طرح مکمل کرسکتی ہیں اور سماج کی ترقی میں ان کی حصے داری کس قدر ضروری ہے۔ اور یہ کام اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک مردوں کے فکر و عمل میں تبدیلی نہیں آتی اور وہ عورتوں کو مساوی حیثیت دینے کو تیار نہیں ہوجاتے۔

□□□

42, Sabarmati Hostel, JNU, New Delhi-67

جامع انگریزی۔اردو لغت (حصہ اوّل تا ششم)

مدیرِ اعلا: کلیم الدین احمد

- ☆ محققین، مترجمین، دفتری اہل کاروں، اساتذہ، قانون دانوں، اہل علم وقلم، صحافیوں، طلبہ اور عام لوگوں کی روزمرّہ ضروریات کے لیے یکساں افادیت کی حامل یہ انگریزی اردو لغت ڈھائی لاکھ سے زائد الفاظ و اصطلاحات ومعانی کا احاطہ کرتی ہے۔
- ☆ یہ لغت دنیا کے کسی بھی موضوع پر انگریزی الفاظ کے اردو مترادفات فراہم کرنے میں آپ کی مدد کرے گی۔
- ☆ تمام مروّج علوم وفنون سے متعلق انگریزی/اردو الفاظ و اصطلاحات کا ایک جامع ذخیرہ۔
- ☆ مترادفات، محاورات اور تشریحات سے مزین اپنی نوعیت کی پہلی مستند، وقیع اور ضخیم لغت جو ویبسٹر کو بنیاد بنا کر تیار کی گئی ہے۔
- ☆ اردو زبان میں نئے سائنسی تصورات اور نئی علمی جہتوں کے اضافے کے ساتھ۔
- ☆ اکیسویں صدی کے علمی تقاضوں سے ہم آہنگ ....
- ☆ دوسو سے زائد سائنسی وسماجی علوم وفنون پر محیط ....
- ☆ امریکی/برطانوی انگریزی کے الفاظ کی صراحت کے ساتھ ....
- ☆ قومی اردو کونسل کا ایک یادگار کارنامہ .... ایک تاریخی دستاویز، بڑا سائز 11.5x911۔ عمدہ کاغذ، بہترین طباعت .... کمپیوٹر شدہ کتابت مضبوط مطلا جلد .... صفحات: حصہ اوّل (1217، قیمت:-/400)، حصہ دوم (1062، قیمت:-/600)، حصہ سوم (1091، قیمت:-/600)، حصہ چہارم (866، قیمت:-/600)، حصہ پنجم (1042، قیمت:-/600)، حصہ ششم (1012، قیمت:-/600) براہ راست طلب فرمائیں یا کسی کتب فروش سے خریدیں۔

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: روہت سرن
ترجمہ: فاخر شہیر عباسی

ہندستانی مردم شماری: خانگی جائزہ

حال ہی میں ہندستان کی مردم شماری 2000 کے اعداد وشمار جاری کیے گئے ہیں۔ یہ اعداد وشمار ملک کے عوام کے رہن سہن، املاک، تعلیم اور ان کی سطح زندگی سے متعلق تمام معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ انھیں یکجا کرنے کا کام 20لاکھ افراد نے کیا اور ہندستانی شعبۂ مردم شماری نے ان کی بنیاد پر رپورٹ کا مسودہ تیار کیا۔ گھر گھر جا کر کیا گیا یہ اپنی قسم کا پہلا سروے ہے، جو ایک دہائی میں ایک بار کیے جانے والے مردم شماری سروے سے پہلے کیا گیا۔ یہ اعداد وشمار ملک کی تصویر سامنے رکھ دیتے ہیں۔ اپریل سے جون 2000 کے درمیان مردم شماری کرنے والوں نے ملک کے 593 ضلعوں اور 25ریاستوں اور مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں کے ہر گھر پر دستک دی۔ بنگلوں سے لے کر جھونپڑیوں میں رہنے والے ہر خاندان سے ان کے مکان کی شکل، بنیادی سہولتوں مثلاً پانی، بجلی کی دستیابی کے بارے میں پوچھا۔ یہ بھی معلوم کیا گیا کہ ٹی وی، ریڈیو یا کار، اسکوٹر میں سے ان کے پاس کیا ہے اور کتنے لوگوں کے بینک کھاتے ہیں۔ اس مردم شماری کے بارے میں مردم شماری کمشنر جینت کمار باٹھیا کہتے ہیں ''اکیسویں صدی کے ہندستان کے لیے ہم نے کسوٹی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔''

اس مردم شماری سے برآمد نتیجے دلچسپ بھی ہیں اور معلوماتی بھی۔ ہندستان میں 17.9 کروڑ رہائشی مکان ہیں، یعنی ہر گھر میں اوسط چھ لوگ رہتے ہیں۔ تقریباً 40فیصد ہندستانی خاندان ایک کمرے والے مکان میں رہتے ہیں۔ 39فیصد شادی شدہ جوڑوں (8.6 کروڑ) کو اپنے لیے الگ کمرہ میسر نہیں ہے۔ ملک میں مذہبی عبادت گاہوں کی تعداد (24لاکھ) اسکولوں، کالجوں اور اسپتالوں کی کل تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ تقریباً 53فیصد خاندان ایندھن کے لیے لکڑی کا استعمال کرتے ہیں (پھر بھی صرف 18فیصد عوام کے استعمال میں آنے والی رسوئی گیس پر Subsidy ہٹاتے وقت حکومت کو پسینہ آجاتا ہے)۔ زیادہ تر ریاستوں میں منسلک بیت الخلا والے مکانوں کی تعداد ان مکانوں سے کم ہے جن میں ٹی وی موجود ہے۔ صارف کی ترجیحات پر مطالعہ کی پہل کرنے والی نیشنل کونسل فار اپلائیڈ اکنامک ریسرچ کے سابق ڈائرکٹر جنرل ایس.ایل.راؤ کہتے ہیں۔'' اس سے ہماری غلط ترجیحات کا تو پتہ چلتا ہی ہے، یہ عوامی صحت اور صفائی کے تئیں لاپرواہی کی بھی عکاس ہے۔''

ان اعداد وشمار سے عرصہ سے چلے آ رہے کئی دعوے بھی غلط ثابت ہوئے ہیں۔ پنجاب سو فیصد گھروں میں بجلی پہنچانے کا دعوا کرتا رہا ہے، لیکن مردم شماری سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں 4لاکھ خاندان بجلی کے بغیر ہی گزارا کر رہے ہیں۔ ہندستانیوں میں اخراجات کے بڑھتے رجحان سے وابستہ کچھ نقوش بھی اجاگر ہوئے ہیں۔ کئی بڑی کمپنیاں ملکی وغیر ملکی اشیائے صرف کو خریدنے کے لیے ہندستانیوں کو للچانے میں ناکام رہی ہیں۔ ہندستانی اتنی کاریں، فریج یا ٹی وی نہیں خریدتے جتنی کہ 90 کی دہائی میں امید کی گئی تھی، وہ بھی آمدنی کی سطح بے حد تیزی سے بڑھنے کے باوجود۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک کے صرف 52فیصد عوام ایسے مکانوں میں رہتے ہیں جن کی دیواریں اور چھت پختہ ہیں۔ صرف 56 فیصد کے گھروں میں بجلی ہے اور 38 فیصد کو ہی پانی مہیا ہے۔ جب ان خاندانوں کی آمدنی بڑھتی ہے تو وہ اشیائے صرف خریدنے کی جگہ یہ سہولیات یکجا کرنے کے اخراجات کو اوّلیت دیتے ہیں۔ ہندستان لیور لمیٹیڈ کے اعلا ماہر معاشیات سدھارتھ رائے کہتے ہیں،'' پختہ فرش، باتھ روم، باورچی خانہ اور پانی و بجلی کا کنکشن لوگوں میں اشیائے صرف کی مانگ کی علامت ہیں۔''

ہر طبقے کے اعداد وشمار میں کافی تضاد پایا گیا ہے۔ یہ تضاد دیہی اور شہری خاندانوں کے درمیان اور ریاست گیر سطح پر بھی پایا گیا ہے۔ ہر اعداد وشمار الگ الگ طبقے کے لوگوں کے لیے الگ الگ معلومات کا ذریعہ ہے۔ اس وسیع سروے کی تفصیلات کا جب آپ مطالعہ کریں گے تو آپ کو کبھی تعجب ہوگا، کبھی مایوسی ہوگی اور کبھی خوشی ہوگی، یہاں تک کہ فخر کا احساس بھی ہوگا۔ یہ اعداد وشمار ہندستان اور ہندستانیوں کا وہ چہرا پیش کرتے ہیں جسے آپ نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔

رہائش:

نوے کی دہائی میں 1991 سے 2001 کے درمیان دہلی کی آبادی میں 46 فیصد کا زبردست اضافہ ہوا۔ پھر بھی یہاں کے 33لاکھ گھروں میں سے 11 فیصد خالی پڑے ہیں۔ 3لاکھ سے زائد مکان تو شاید حصولِ کرایہ قانون کی وجہ سے خالی ہیں۔ گجرات میں 14 فیصد گھر خالی پڑے ہیں۔ یہ حقیقت ملک کے 8.6 کروڑ شادی شدہ جوڑوں جن کے رہنے کے لیے الگ کمرا نہیں ہے اور ایک کمرے میں رہنے والے 35فیصد شہریوں کو کڑوی ہی لگے گی۔ تقریباً ایک تہائی شہری ہندستانی خاندانوں کے لیے گھر کے حدود میں باورچی خانہ، غسل خانہ اور بیت الخلا شامل نہیں ہے۔ کئی معاملوں میں تو پانی اور بجلی کی فراہمی بھی اس میں شامل نہیں ہے۔ حکومت اس سلسلے میں کیا کرسکتی ہے؟ بجلی پر دی جانے والی سبسڈی (سالانہ 35,000 کروڑ روپے) کا کچھ حصہ عوامی رہائشی سہولیات کو دے کر صورتِ حال میں بہتری لائی جاسکتی ہے۔

سہولیات:

اپنی آمدنی کے حساب سے ہندستانیوں کو پینے کا پانی، بجلی، کھانا پکانے کا ایندھن جیسی بنیادی سہولیات اشیائے صرف کے مقابلے میں کم ہی مل پاتی ہیں۔ 62 فیصد یعنی 11.8 کروڑ خاندانوں کو اپنے گھر پر پینے کا پانی نہیں ملتا۔ 50 لاکھ سے زیادہ خاص کر گاؤں کے خاندانوں کو تالاب، ندی، جھرنا یا دوسرے ذرائع سے پانی ڈھو کر لانا پڑتا ہے۔ شہروں میں حالات نسبتاً بہتر ہیں۔

شہروں میں 65 فیصد خاندانوں کو اپنے گھر پر پانی مہیا ہے۔ لیکن مردم شماری میں صرف یہ دیکھا گیا ہے کہ پانی مہیا ہے یا نہیں، یہ نہیں دیکھا گیا کہ وہ کتنی دیر کے لیے مہیا ہوتا ہے اور اس کی کوالٹی کیسی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق زیادہ تر گھروں کو روزانہ اوسطاً چار گھنٹے سے زیادہ پانی مہیا نہیں ہوتا۔ اور زیادہ تر یہ پانی پینے کے قابل نہیں ہوتا۔ پانی مہیا کرنے کے سلسلے میں ہندستان میں وہی مسائل ہیں جو زیادہ تر بنیادی سہولیات کے ساتھ ہیں۔ کم قیمت اور کم حصول یابی، زیادہ تر ہندستانی پانی کے لیے قیمت نہیں ادا کرتے یا استعمال کے مطابق نہیں دیتے۔ سہولیات تک بہتر رسائی کا ایک ہی طریقہ ہے: لوگوں کو صارف بنایا جائے، سہولیات کی قیمت متعین کی جائے اور لوگ دوسری اشیائے خورد و نوش کی طرح انھیں بھی خریدیں۔

بجلی:

جہاں تک بجلی کی فراہمی کا معاملہ ہے، شہروں اور گاؤوں میں سب سے زیادہ فرق نظر آتا ہے۔ شہروں میں 88 فیصد گھروں کو بجلی حاصل ہے جبکہ گاؤوں کے 44 فیصد خاندانوں کو ہی بجلی مل پاتی ہے۔ اس لیے تعجب کی بات نہیں کہ تقریباً 50 فیصد گاؤں کے گھروں میں کراسن تیل سے ہی روشنی ہوتی ہے۔ مردم شماری سے یہ حقیقت بھی سامنے آئی ہے کہ ملک کی ایک بھی ریاست ایسی نہیں ہے جو 100 فیصد گھروں میں بجلی پہنچانے کا دعوا کرے۔ یہ مردم شماری سبھی گاؤوں اور شہروں میں بجلی دینے کا دعوا کرنے والی ریاستوں کی پول بھی کھولتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہماچل پردیش، گوا اور پنجاب اپنے 90 فیصد عوام کو بجلی مہیا کروا کر دوسری ریاستوں سے کہیں آگے ہیں۔ خراب جغرافیائی حالت کو دیکھتے ہوئے ہماچل پردیش کی کامیابی واقعی قابلِ ذکر ہے۔ اس معاملے میں سب سے نچلی سطح پر بہار ہے، جہاں ایک کروڑ 40 لاکھ گھروں میں سے 10 فیصد کو ہی بجلی ملتی ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ صرف 56 فیصد ہندستانی ہی بجلی کا استعمال کرتے ہیں، پھر بھی ریاستی بجلی محکموں کا گھاٹا 20000 کروڑ روپیہ ہے۔ اگر بجلی کی کھپت بڑھتی ہے تو دیہی علاقوں میں بجلی محکموں کا خسارہ اور بڑھے گا، یعنی لوگوں کی قوتِ خرید کے بجائے انتظامیہ کی ناکارکردگی ہی کم کھپت کے لیے ذمے دار ہے۔

باورچی خانہ:

2.2 کروڑ یعنی 12 فیصد ہندستانی خاندان آج بھی کھلے میں کھانا بناتے ہیں۔ دوسری طرف اچھی بات یہ ہے کہ 76 فی صد شہری ہندستانی گھروں میں الگ باورچی خانوں کا انتظام ہے۔ باورچی خانہ ہو یا نہ ہو، 52.5 فیصد خاندان اب بھی ایندھن کے لیے لکڑی پر ہی منحصر ہیں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ شہروں میں بھی 23 فیصد خاندان لکڑی پر ہی کھانا بناتے ہیں۔ کھانا پکانے کی گیس، جس کی گھٹتی بڑھتی قیمتیں ہر حکومت کے لیے سردرد بنی رہتی ہیں، کا استعمال صرف 18 فی صد خاندان (شہری خاندانوں کا 48 فی صد) کرتے ہیں۔ 10 فی صد دیہی گھروں میں کھانا پکانے کے ایندھن کی شکل میں بچی ہوئی فصل کا استعمال ہوتا ہے۔ حکومت کی کوششوں کے باوجود گاؤوں میں بایو گیس کا معمولی استعمال ہی ہوتا ہے۔

سرمایہ:

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اشیائے صرف کی خریداری لوگوں کی آمدنی اور ان کی طرزِ زندگی پر منحصر ہے لیکن ہندستان میں ایسا نہیں ہے۔ بنیادی سہولیات کا جو حال نظر آتا ہے اس کے مقابلے میں اشیائے صرف زیادہ لوگوں کے پاس ہیں۔ جن گھروں میں باورچی خانہ اور بیت الخلا نہیں ہے، وہاں بھی ٹی.وی. اور دو پہیہ گاڑی تک مل جائیں گے۔ گھریلو سامان بنانے والی کمپنیوں کا کہنا ہے کہ پیسے کی کمی نہیں، بلکہ بجلی کی غیر موجودگی ان کے سامانوں کی مانگ میں کمی کے لیے ذمے دار ہے۔

ایس.ایل.راؤ جیسے ماہر معاشیات کو تو اس بات پر حیرت ہے کہ کمپنیاں بجلی کی فراہمی کی حدود کو جانتے ہوئے کراسن تیل سے چلنے والے ٹی.وی. کیوں نہیں بناتیں۔ 2001 میں ہندستان میں 50 لاکھ ذاتی چار پہیہ گاڑیاں تھیں۔ ان میں سرکاری اور تجارتی کاموں کے لیے استعمال ہونے والی گاڑیاں شامل نہیں ہیں۔ 2003 میں کاروں کی فروخت 50,000 ماہانہ کی رفتار سے بڑھ سکتی ہے۔ جہاں تک دو پہیہ گاڑیوں کا سوال ہے، دیہی ہندستان بھی اب شہروں سے اچھا مقابلہ کرتا نظر آ رہا ہے۔

یہ دور ٹیلی ویژن بنانے والی کمپنیوں کے لیے خوشیاں منانے کا ہے کیوں کہ ہندستانی خاندان سبھی اشیائے صرف میں ٹی.وی. کو ہی سب سے زیادہ اولیت دیتے ہیں۔ ہندستانی لوگ نہانے اور بیت الخلا کے لیے گھر سے میلوں دور جانا گوارا کر سکتے ہیں لیکن ٹی.وی. سیٹ تو ان کے گھر میں موجود ہونا ہی چاہیے۔ اس معاملے میں دیہی ہندستان بھی پیچھے نہیں ہے۔ ہر پانچ ہندستانی خاندان میں سے ایک کے پاس ٹی.وی. سیٹ موجود ہے۔ یعنی اس شرح سے کل 2.6 کروڑ ٹی.وی. سیٹ موجود ہیں۔ اس سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ ہندستان میں کسی اور الیکٹرانک سامان کے مقابلے میں ٹی.وی. کے اتنے زیادہ ماڈل کیوں موجود ہیں۔ □□□ (بشکریہ "انڈیا ٹوڈے" نئی دہلی 28 رجولائی 2003)

مترجم کا پتہ:
355, Jhelam Hostel, JNU, New Delhi-110067

تحریر: ریاض ملک
ترجمہ: محمد عمران ندوی

پلاسٹک: مفید یا مضر؟

اگر آج انسان اپنے احوال و کوائف کا جائزہ لے، اور گردوپیش کا باریک بینی سے مشاہدہ کرے تو اسے اندازہ ہوگا کہ پلاسٹک ہماری روزمرّہ کی زندگی میں کس حد تک شامل ہوگئی ہے، مثلاً قلم، جس سے ہم لکھتے ہیں، ٹیلیفون سیٹ، آفس اور گھر کے سازوسامان، وال پیپر، کمپیوٹر، تھیلے، ملبوسات، یہاں تک کہ کھانے کی حفاظت کے برتن، دواؤں کے پیکٹ اور پانی کی بوتل، ہر شے میں کلی یا جزوی طور پر پلاسٹک شامل ہے، علاوہ ازیں بعض ایسی بھی چیزیں ہیں جن کا ہماری زندگی میں کافی عمل دخل ہے لیکن وہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں جیسے بجلی کے تار جو دیواروں میں پوشیدہ رہتے ہیں اور چشمہ لگانے والوں کے لیے لینس جو ان کی آنکھوں کی حفاظت اور واضح دیکھنے میں کافی معاون ہوتا ہے، حقیقتاً پلاسٹک ہی کی ایک قسم ہے۔

پلاسٹک کی تاریخ

عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پلاسٹک گذشتہ پچاس ساٹھ سال قبل کی ایجاد ہے، حالانکہ انیسویں صدی میں ہی اس کی ایجاد ہوچکی تھی اور اس کا پہلا نمونہ اس کے موجد الگزنڈر پارکس کے نام سے منسوب کرتے ہوئے Parkesine کے نام سے لندن میں 1862 میں منعقدہ بین الاقوامی نمائش میں پیش کیا گیا تھا۔ لیکن اس وقت کی پلاسٹک موجودہ پلاسٹک سے مختلف تھی، کیونکہ وہ نہ تو پٹرول کی آمیزش سے بنائی گئی تھی اور نہ ہی قدرتی گیس کی آمیزش سے، بلکہ وہ سیلولوز (Cellulose) سے حاصل کردہ ایک مادے کا حصہ تھی اور اس میں نئی بات یہ تھی کہ وہ حرارت کے زیر اثر کوئی بھی شکل اختیار کرلیتی تھی اور ٹھنڈی ہونے پر اسی شکل میں ٹھوس ہوجاتی تھی جس میں اسے ڈھالا گیا ہو۔ پارکس نے فطری ربر کے متبادل کے طور پر اسے بازار میں پیش کرنا چاہا جو بیشتر صنعتی علاقوں میں استعمال ہوتا تھا۔ لیکن اس کی پیداوار پر آنے والی بھاری لاگت کی وجہ سے وہ ایسا نہ کرسکا، لہٰذا پارکس نے اس کی لاگت کو کم کرنے کے لیے معمولی معیار کی پلاسٹک بنانے کا ارادہ کیا جس کی وجہ سے اس کی بازاری شہرت بھی متاثر ہوئی۔ یہاں تک کہ 1868 میں پارکس کمپنی کا دیوالیہ نکل گیا۔

پارکس کے بعد بھی اس سلسلے میں بہت ساری کوششیں ہوئیں اور انھی کوششوں کے نتیجے میں مختلف قسم کے نئے نئے مادے (materials) مختلف تجارتی ماحول سے بازار میں آتے رہے اور بعض نے تھوڑی بہت شہرت و مقبولیت بھی حاصل کی جن میں سیلولائڈ (Celluloid) بھی تھا جو انیسویں صدی کے آخر میں استعمال ہوا اس کے بعد بیکلایٹ مادّہ منظر عام پر آیا جو اپنے موجد لیو بیکلانٹ کی طرف منسوب تھا۔ یہ ٹھوس مادہ ہوتا تھا جس کے جلنے کا امکان نہیں تھا اور جسے بشمول جنگی صنعتوں کے مختلف میدانوں میں استعمال کیا گیا۔ بعد ازاں پلاسٹک کی اور بھی قسموں کی ایجاد جاری رہی، تاکہ بازار کے بدلتے ہوئے تقاضے پورے ہوسکیں۔ انھی میں سیلوفین (Cellophane)، نائیلون (Nylon) اور ٹیفلون وغیرہ ہیں جو آج بھی موجود ہیں۔

تجارتی سطح پر اس کی پیداوار وسیع پیمانے پر عملاً 1930 سے 1940 کے درمیان شروع ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اس کی ضرورت بڑے پیمانے پر پیش آنے کی وجہ سے اس کی پیداوار میں اضافہ ہوا۔ اس وقت پلاسٹک کی ایک اہم قسم پولیتھین تھی، جس کو دوسری جنگِ عظیم کے دوران اتحادی فوجوں نے کثرت سے استعمال کیا۔ اس کے ذریعے راڈار کا وزن ہلکا کرکے اسے اس قابل بنایا گیا کہ اسے زمین پر نصب کرنے کے بجائے ہوائی جہاز پر لادا جاسکے۔ جنگ کے بعد بھی اس کی پیداوار جاری رہی، اور حسب ضرورت اسے استعمال کیا جاتا رہا۔ مثال کے طور پر صرف امریکی مارکیٹ میں پلاسٹک کی سالانہ پیداوار تین سو بلین ڈالر سے زائد ہے اور اس میدان میں کام کرنے والوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ ملین ہے، جن کا تعلق مختلف میدانوں سے ہے۔

پلاسٹک ہی کیوں؟

قارئین کے ذہنوں میں یہ سوال آسکتا ہے کہ آخر پلاسٹک کی کامیابی کا راز کیا ہے کہ بغیر کسی انقطاع کے وہ ایک صدی سے زائد عرصے سے استعمال ہورہی ہے۔ اس کا جواب ہمیں خود اس مادّے اور اس سے بنی ہوئی چیزوں

سے جنھیں ہم مختلف ضرورتوں کے تحت استعمال کرتے ہیں مل سکتا ہے۔ یہاں تک کہ ان چیزوں سے بھی پلاسٹک کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے جنھیں ہم روزمرّہ کی زندگی میں نہیں دیکھ پاتے۔ مزید یہ کہ دوسرے مادّوں کی نسبت کم لاگت میں پلاسٹک بنایا جاسکتا ہے۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس کی بھی مختلف قسمیں ہیں جنھیں خاص ترکیب اور خاص کیمیاوی مادّوں سے بنایا جاتا ہے۔

پلاسٹک کی بہت ساری خصوصیات ہیں جن کے باعث اسے اتنی مقبولیت حاصل ہے مثلاً اس کا خفیف الوزن ہونا، طبعی اور فطری عوامل کے دست برد سے محفوظ رہنا، بہت ہی نرم ہونا، مضبوط ہونا۔ خواہ نرم ہو یا سخت اس کی رنگارنگی، سرد اور گرم کو برداشت کرنے کی قوت، جاذبِ نظر ہونا اور کم لاگت میں اس سے اشیا کا تیار ہونا وغیرہ یقیناً پلاسٹک کی ایسی صفات ہیں جو کسی دوسرے فطری مادّے میں نہیں پائی جاسکتیں۔ لہٰذا اگر ہم چاہیں بھی کہ پلاسٹک کی جگہ کوئی دوسرا مادّہ استعمال کریں تو ہمیں اس کے وزن، رنگ، خوبصورتی یا حجم سے سمجھوتا کرنا ہوگا، جو کہ نہ صرف ہمارے نقل وحمل میں بلکہ قیمتوں پر بھی کافی اثر انداز ہوگا۔

اگر ہم پلاسٹک کے فوائد پر نظر ڈالیں تو ہمیں اس کی اہمیت کا اندازہ ہوگا، کہ یہ ہمارے لیے کس حد تک ضروری ہے۔ اس دور کی سب سے اہم ضرورت پانی جس کی وجہ سے آج بہت سے شہروں اور ملکوں میں لوگ پریشانی کا سامنا کر رہے ہیں، اسے بحفاظت ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے میں یہی پلاسٹک کی بوتلیں معاون ہوتی ہیں جو کہ نہ صرف کم وزن ہیں بلکہ پانی کو طبعی شکل میں رکھنے میں بھی معاون ثابت ہوتی ہیں۔ اس کی جگہ اگر ہم شیشے کی بوتلیں استعمال کریں تو یقیناً ہمیں بلاوجہ پانی سے زیادہ بوتل کا وزن ڈھونا پڑے گا۔ خواہ گھر میں ہو یا کار میں یا پھر ریلوں اور ہوائی جہازوں میں جہاں وزنی سامان لے جانا کسی مصیبت سے کم نہیں۔ علاوہ ازیں ٹوٹنے پھوٹنے کا خطرہ الگ لگا رہے گا۔

پلاسٹک اور ماحول

ماحول پر پلاسٹک کے کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں، یہ جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم دو اہم پہلوؤں کا بنظرِ غائر مطالعہ کریں، سب سے پہلے تو یہ دیکھیں کہ پلاسٹک قدرتی اور طبعی چیزوں کی حفاظت میں کس حد تک معاون ہے، اور دوسرے یہ کہ اس کی وجہ سے ماحول میں کس قدر آلودگی کے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ جہاں تک قدرتی اور طبعی چیزوں کی حفاظت کا سوال ہے تو اوّل تو اس میں جو مادّہ لگتا ہے وہ بہت قلیل مقدار میں ہوتا ہے جبکہ فائدہ اس سے بہت زیادہ اٹھایا جاتا ہے، دوم پلاسٹک سے بہت سی ایسی چیزیں بنائی جاتی ہیں جنھیں صرف طبعی اور قدرتی نوادرات سے ہی بنانا ممکن تھا۔ چنانچہ آج پلاسٹک سے وہ ساری چیزیں بنائی جارہی ہیں جیسے لکڑی، ربر، تانبا، المونیم اور دیگر قدرتی اشیا سے بنایا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ حیوانات سے حاصل کردہ اون کی جگہ بھی ہم آج پلاسٹک سے تیار کردہ جیکٹ استعمال کرتے ہیں۔ اب اگر ہم اپنے اردگرد کا جائزہ لیں اور صرف یہ دیکھیں کہ آج مارکیٹ میں جس قدر پولیتھن کا استعمال ہو رہا ہے، کیا اس کی جگہ ہم کسی اور مادّے سے بنائے ہوئے تھیلے کو استعمال کر سکتے ہیں؟ اور اگر کریں جیسا کہ آج کل پلاسٹک کی جگہ کاغذ کے لفافوں کو استعمال کیا جارہا ہے تو کیا اس سے آلودگی کم ہو جائے گی یا اس میں مزید اضافہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ہم کاغذ کو تیار کرنے کے لیے درختوں کا سہارا لیں گے اور ان کے کٹنے سے آلودگی میں مزید اضافہ ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ جس طرح سے ہم بار بار پلاسٹک کو استعمال کر لیتے ہیں، کاغذ کی شکل میں یہ مشکل ہی نہیں ایک حد تک ناممکن ہے۔

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ نقل وحمل کے بھی بہت سارے مسائل ہیں۔ پلاسٹک کے تھیلے اور گلاس جنھیں ایک ٹرک میں رکھ کے لے جایا جاسکتا ہے انھیں کاغذ کی صورت میں کئی ٹرکوں میں لے جانا ہوگا اور اس کے دبنے اور پھٹنے کا اندیشہ الگ لگا رہے گا۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ سڑکوں اور چوراہوں پر جو پلاسٹک پڑے رہتے ہیں، اس سے شہر کی گندگی اور آلودگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے ماحول بھی پراگندہ ہوتا ہے، لیکن ہمیں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کرنا چاہیے کہ پلاسٹک سے زیادہ اس سلسلے میں اس کے استعمال کرنے والوں کی غلطی ہے۔ حقیقتاً یہ مادہ ہمارے لیے بہرصورت مفید ہے لیکن شرط یہی ہے کہ صحیح طریقے سے اس کا بقدرِ ضرورت استعمال کیا جائے نہ کہ آلودگی کے نام پر اس کو نظرانداز کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ ہمارے لیے اب اس قدر ضروری ہوگیا ہے کہ ہم اس سے نجات حاصل کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ یہ ہمارے سامنے ہمیشہ موجود رہے گا خواہ میز، کرسی کی شکل میں ہو یا بچوں کے کھلونوں کی شکل میں۔

(بشکریہ "القافلہ" ریاض، سعودی عرب، جولائی، اگست 2003)

□□□

مترجم کا پتہ:
C-81, Abud Fazal Encalve
Jamia Nagar, Okhla,
New Delhi-110025

علیم صبا نویدی

چنئی میں اردو نثر

چنئی (مدراس) میں اردو نثر کا تقریباً تین سو سالہ سفر مذہبی، علمی اور ادبی رجحانات کا حامل رہا ہے۔ اس دور کا علمی سرمایہ تصوف کے نورانی پرتو کے زیر اثر تھا۔ سرزمین مدراس میں جن بزرگانِ دین نے اردو زبان و ادب میں تصنیف و تالیف کا کام کیا ہے، ابتداءً اُن کے پیشِ نظر زبان و ادب کی ترویج کے بجائے مذہب اور تصوف کی نشر و اشاعت کا کام تھا اور وہ عوامی بول چال اور عام لوگوں کی زبان لے کر عوام الناس تک پہنچنا اور اپنی بات ان لوگوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔

شہر مدراس میں اردو نثر کی شروعات حضرت شاہ سلطان (ولادت 1609) کی تصانیف ''دوالاسرار'' اور ''زنجیرہ'' 1 سے ہوتی ہے۔ آپ کے والد کا نام سید فخر الدین سلطان حسینی تھا۔ حضرت شاہ سلطان سلسلۂ بندہ نواز کے بزرگوں میں سے ہیں۔ آپ کی مذکورہ دونوں کتابیں قدیم اردو تصوف کے موضوع پر مرقوم ہیں۔ 2 اس کے بعد سید شاہ عبدالقادرؒ معروف بہ میران شاہ ولی اللہ منزوی الجیلین (وفات 1146ھ مطابق 1733) کی تصنیف ''خلاصۃ الرویۃ'' 3 ہے۔ اس کتاب میں تصوف کے مسائل کی تشریح بہت سیدھی سادی اور عام فہم زبان میں ملتی ہے۔ ان تصانیف کے علاوہ حضرت شیخ محمد مخدوم عبدالحق ساویؒ عرف حضرت دستگیر (وفات 1165ھ مطابق 1752) کا رسالہ ''مفتاح الکل'' (جو تصوف پر دکنی اردو میں ہے) حضرت سید شاہ ابوالحسن قربیؒ (وفات 1182ھ مطابق 1769) کا ''رسالۂ تصوف''، حضرت باقر آگاہ (وفات 1220ھ مطابق 1805) کی تصنیف ''ریاض السیر'' اور مختلف رسائل کے نثری دیباچے (جو زبان کے قواعد کی بحث پر مشتمل ہیں) حضرت مولانا مولوی محمد غوث شرف الملک بہادر (وفات 1238ھ مطابق 1822 کی کتاب ''ترجمۂ کیدانی'' 4 حضرت سید شاہ ابوالحسن قادری محویؔ) (وفات 1243ھ مطابق 1827) کا رسالۂ تفصیل المراتب فی اطوار المراتب'' 5 و دیگر رسائل تصوف، قاضی بدرالدولہ محمد صبغۃ اللہ (وفات 1280ھ مطابق 1863) کا ''ریاض النسوان'' و دیگر کتب دینیہ اور میر مہدی واصف (وفات 1290ھ مطابق 1873) کے مختلف النوع تصانیف اور تراجم سے تمل ناڈو میں اردو نثر کا تاریخی سفر جس خوشگواری، شادابی اور بھرپور آب وتاب کے ساتھ جاری تھا وہ خالص دکنی پیرائے سے دکنی اردو کے پیرایۂ اظہار میں منتقل ہو کر حضرت سید شاہ عبدالغفار مسکین شاہ (وفات 1326ھ مطابق 1908) کی شرح ''من لگن'' (از بحری) حضرت محمد بدیع الدین فاروقی (وفات 1959) مدیر ''مورخ'' مدراس کے مضامین اور تراجم، محمد اسماعیل سیٹھ مغمومؔ (وفات 1348ھ مطابق 1929) کا سفر نامہ ''ارمغانِ کلکتہ'' اور دیگر مذہبی و دینی مضامین۔ حضرت نواب تجمل حسین خان ایمانؔ گوپاموی (وفات 1354ھ مطابق 1935) کی تقریباً ایک درجن کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ سبھی کتابیں مذہبی موضوعات پر بڑی شگفتہ اور ٹکسالی زبان میں ہیں۔ ان تمام تصانیف میں موصوف کی معرکتہ الآرا، نادر اور نایاب تصنیف ''پردہ'' ہے۔ محمد منور خان گوہر مدراسی (وفات 1361ھ مطابق 1941) کا تاریخی اور تحقیقی کارنامہ ''تذکرۂ شعرائے دکن''، ''سخنوران بلند فکر'' (جلد اول مطبوعہ 1936 اور جلد دوم مطبوعہ 1953) تمل ناڈو کی اردو نثر کی تاریخ کو ہمیشہ روشن کرتی رہیں گی۔

محمد منور خان گوہر مدراسی کی متذکرہ تالیف نے جہاں شہر مدراس کے نثری ادب کو ایک نئے انقلابی اور ادبی ذائقہ سے آشنا کیا ہے۔ وہیں مولانا رحم احمد فاروقی (وفات 1966)، مولانا ابوبکر نظمی، مولانا ابوالجلال ندوی، علامہ شاکر نائطی کے علمی، تحقیقی، تنقیدی، بصیرت افروز مضامین اور ادبی تذکرے، ڈاکٹر عبدالحق کا سفرنامہ ''اطالیہ'' اور مجموعۂ مضامین ''انشاءِ حق'' اور شرر آلندوری اور مولانا حبیب خان سرورش داؤدی کی علمی اور معلوماتی تحریروں نے مدراس میں اردو نثر کی فضا کو ایک گونہ رنگ و نور سے مزین و آراستہ کیا ہے۔

جنگِ آزادی کے بعد شہرِ مدراس میں اردو نثر کا چلن اور بھی عام ہوا۔ جس طرح نظم میں طبع آزمائی کی جاتی تھی اُسی طرح نثری تخلیقات کی تخلیق پُر زور طریقے پر ہوئی۔ یہاں اس دور کے اہم اور ممتاز نثر نگاروں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ جنھوں نے شہر مدراس ہی نہیں بلکہ سارے تمل ناڈو کے اردو کے جغرافیائی نقشے کو اپنی تمام تر ذہنی توانائیوں اور تابانیوں سے سیراب و شاداب کیا ہے۔

مولوی سید ابوالبرکات انور (1976-1900):- آپ ایک عرصہ تک روزنامہ ''آزاد ہند'' اور روزنامہ ''مسلمان'' میں صحافتی خدمات انجام دیتے رہے۔ موصوف کے اکثر و بیشتر اداریے ''نوائے وقت''، ''لاہور کے کالم''، ''مانگے کا اجالا'' کی زینت بنتے رہے۔ آپ کی سیاسی، علمی اور مذہبی تحریریں آج بھی ''مسلمان'' کے صفحات پر محفوظ ہیں۔

سید سلطان محی الدین بہمنی:- موصوف روزنامہ ''ہمدرد'' مدراس کے مدیر تھے۔ تیر و نشتر کے تحت آپ کا لکھا ہوا حالات حاضرہ پر تبصرہ آپ کی خاص پہچان بن چکا ہے۔ آپ کی ادارت میں ایک دینی ماہ نامہ ''امام'' بھی منظر عام پر آچکا ہے جس میں مذہبیات پر موصوف نے بڑے جاندار مضامین لکھے ہیں۔

عبدالعزیز عادل (-1909):- موصوف ہندی اردو کے شاعر،

ڈرامہ نویس اور ناول نگار ہیں۔ آپ کی زبان شستہ اور شائستہ ہے۔ کئی نصابی کتابیں ترتیب دی ہیں۔ ''فن بلاغت'' پر بھی آپ کی کتاب ''سخن فہمی'' ہفتہ روزہ ''رفیق ملت'' مدراس میں قسط وار شائع ہو چکی ہے۔ آپ نے ایک طویل ناول ''دولت کی بھینٹ'' بھی لکھا جو علامہ راشد الخیری کے معاشرتی رنگ میں تھا، لیکن افسوس ہے کہ یہ ناول آج تک زیور طباعت سے آراستہ نہ ہو سکا۔

حیدر علی خان حیدر (1910-1980):- موصوف کا تعلق خاندانِ والا جاہی سے تھا۔ آپ نے ڈاکٹر عبدالحق کرنولی اور مولانا رحیم احمد فاروقی آزاد مرحوم سے بھرپور استفادہ کیا۔ مدراس کی شعری اور ادبی فضا کو بنائے رکھنے میں بہت اہم رول ادا کیا تھا۔ بحیثیت نثر نگار آپ کے دینی اور علمی مضامین ''مانوس خیال''، ماہ نامہ ''منزل''، ''امام'' اور ہفت روزہ ''مبین'' میں شائع ہو چکے ہیں۔ زبان میں سادگی اور رکھ رکھاؤ آپ کے اسلوب کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

حبیب خان سروش داؤدی (1912-1964):- آپ بنیادی طور پر مزاح نگار تھے۔ آپ بھی ہفت روزہ ''شاکر'' مدراس میں بالالتزام کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ آپ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے مضامین کو یکجا کر کے پروفیسر احتشام حسین سے مقدمہ لکھوایا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ موصوف کی وفات کے بعد ان کے ورثاء میں کسی کو اس کی اشاعت کی توفیق نہیں ہوئی، واقعہ یہ ہے کہ شہر مدراس میں مزاح نگاری میں اس قدر بلند و بالا مقام کا حامل کوئی اور فنکار تا حال پیدا نہیں ہوا۔

محمد یوسف کوکن عمری (1916-1990):- آپ کثیر التصانیف قلم کار ہیں۔ آپ نے متعدد انگریزی اور عربی کتابوں کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ آپ کی کتابوں میں امام ابن تیمیہ بہت ہی ضخیم اور متنازعہ فیہ کتاب ہے۔ موصوف کی تحریروں میں ایک صراح کا شکل اور ایک گونہ خشکی پائی جاتی ہے، جس کی وجہ سے قاری پر اس کا تاثر برائے نام ہی ہو پاتا ہے۔ لیکن آپ کی تحریریں مواد اور معلومات کے لحاظ سے بہت جاندار اور وقیع ہوتی ہیں۔

سید عظمت اللہ سرمدی (1919-1978):- آپ ایک صاحب اسلوب نثر نگار تھے۔ آپ کے علمی، ادبی اور دینی موضوعات پر بہت سارے مضامین ''مسلمان'' مدراس، ''شاکر'' مدراس کے علاوہ دینی رسائل میں جگہ پا چکے ہیں۔ آپ نے صحافت میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ آپ کو مختلف علوم سے واقفیت کے ساتھ ساتھ اردو زبان و بیان پر خاص قدرت بھی حاصل تھی۔ مطالعہ وسیع ہونے کی وجہ سے آپ کی نثری تحریریں حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھی۔

دانش فرازی (1921-1981):- حضرت دانش فرازی مرحوم کا تعلق اگرچہ ضلع شمالی آرکاٹ سے تھا۔ لیکن موصوف کی زندگی کا اہم ترین حصہ شہر مدراس کی ادبی فضا کی نذر رہا۔ آپ بنیادی طور پر ایک عہد آفریں شاعر تھے۔ آپ نے جو نثری تحریریں اردو ادب کو دیں، ہمارے آئندہ کے مؤرخ اور محقق کے لیے ایک اَن مول خزانے کا درجہ رکھتے ہیں۔ موصوف کے علمی ادبی اور فکری روشن اُفق کے نیچے سانس لینے والوں میں متعدد شخصیات ہمارے درمیان موجود ہیں جو بظاہر موصوف کے نام سے خود کو منسوب کرنے سے گریز کرتی ہیں۔

ڈاکٹر ذاکرہ غوث (1921-2003):- جہاں تک میری معلومات ہیں میں یہی کہوں گا کہ ڈاکٹر ذاکرہ غوث پہلی خاتون ہیں جنھوں نے تمل ناڈو کے شعراء و ادبا پر نہ صرف مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا بلکہ خواتین خانوادۂ بدرالدولہ کی ادبی اور تعلیمی خدمات پر ایک تفصیلی اور طویل مقالہ لکھا جس پر آپ کو مدراس یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی سند عطا کی تھی۔ غالباً 1964 میں آپ کا ایک مضمون بعنوان تمل ناڈو میں ادب برائے خواتین دو قسطوں میں ''اردو ادب'' دہلی میں شائع ہو چکا ہے۔ آپ کا اہم ترین کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے ''مولانا باقر آگاہ کی شخصیت اور فن'' کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے ایک ضخیم کتاب (مطبوعہ 1995) اردو ادب کو دی جو تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔

محبوب پاشا محبوب (1922-2001):- موصوف کا تعلق نوابانِ آرکاٹ سے ہے، آپ نے اس خاندان کی علمی، ادبی اور دینی خدمات پر بڑے معلومات انگیز مضامین لکھے ہیں جو تمل ناڈو کے ادبی نقشے میں آپ کی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ آپ کی تحریروں کی زبان سادہ، دل چسپ اور اثر آفریں ہوتی ہے۔ آپ نے تحقیق اور تاریخ ادب کو زندگی بھر اپنا لہو دیا ہے اور یقین ہے کہ اس لہو کا ہر قطرہ موصوف کو تمل ناڈو کے ادبی جغرافیہ میں ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

ادیب بھارتی (1923-1971) فرحت کیفی (1933-1979):- یہ وہ دو منفرد افسانہ نگار ہیں جنھوں نے سب سے پہلے مختصر اور نئے انداز کے افسانوں کی بنیاد تمل ناڈو میں رکھی۔ ان دونوں افسانہ نگاروں کے مختصر افسانوں کا دور اس شان و شوکت سے شروع ہوا کہ ان کے پیچھے راقم الحروف کے علاوہ بہت سے نوجوان افسانہ نگاروں نے بھی اپنی بہترین صلاحیتوں کے جوہر دکھائے اور مختصر افسانہ نگاری کے مدار میں آج بھی جلوہ فشاں ہیں۔ ادیب اور فرحت دونوں کے افسانے ہفت روزہ ''قلم دیش'' مدراس، پندرہ روزہ ''روپ'' مدراس اور ''پاکیزہ'' مدراس میں شائع ہو چکے ہیں۔ ادیب بھارتی کا ایک افسانوی مجموعہ 1967 میں کتابت کی منزل سے گزر چکا تھا۔ نہ جانے کن وجوہات کی بنا پر وہ طباعت کا منہ نہ دیکھ سکا۔ اگر ادیب کا یہ مجموعہ منظر عام پر آجاتا تو تمل ناڈو کے افسانوی ادب میں یقیناً ایک اضافے کی حیثیت رکھتا۔

سعد اللہ ممتاز (-1926)، راحی صدیقی (1927-1989) اور لطیف نازی (-1930):- یہ تینوں فن کار ایک دوسرے کے ہم جماعت شاعر اور افسانہ نگار، ہم نوالہ اور ہم پیالہ بھی تھے۔ سعد اللہ ممتاز مدراسی کا رجحان اردو شاعری اور مضمون نگاری کی طرف تھا تو راحی صدیقی کا طبعی میلان شاعری اور افسانہ نگاری کی طرف، لطیف نازی نے بھی شاعری اور افسانہ نگاری کی اصناف سے ہاتھ ملا کر اپنی بہترین صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان تینوں فن کاروں

کی نثری اور شعری تخلیقات تمل ناڈو کے مقتدر رسائل ''معیار ادب''، ''مشعل''، ''پاکیزہ''، ''آزاد نوجوان''، ''مسلمان''، جدید دلچسپ'' اور ''آب وتاب'' میں جگہ پا چکی ہیں۔ ان تینوں فن کاروں کے نثر پارے ایک عجیب کشش انگیز کیفیات سے مملو ہیں اور عنقریب لطیف نازی کی غزلوں کا مجموعہ بنام ''رُخِ روشن'' منظرِ عام پر آنے والا ہے۔

کاوش بدری (1927):- حضرت کاوش بدری کا تعلق بھی ضلع شمالی آرکاٹ سے ہے لیکن موصوف کی ذہنی اور ادبی پرورش و پرداخت میں شہر مدراس کی فضا نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ آپ تمل ناڈو کے ممتاز شاعر، محقق اور نقاد ہیں۔ آپ کی نثری تحریریں طویل ہونے کے باوجود اپنے دامن میں ''معلومات جزویہ'' اور افادات فیضیہ'' کی مہک لیے ہوئی ہوتی ہیں۔ آپ نے ماہ نامہ ''فن کار'' اور ''منزل'' کے ذریعہ اردو ادب میں نہ صرف اپنی پہچان قائم کی بلکہ شہر مدراس کے شعراء و ادباء کی تخلیقی کرنوں کو شمالی ہند کے فن کاروں کے ذہن تک پہنچانے کا وہ کارنامہ انجام دیا ہے جس کو تمل ناڈو کی اردو ادب تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

نورس خیامی (-1929):- آپ کے رومانی اور جاسوسی انداز کے افسانے مدراس کے متعدد رسائل کی زینت بن چکے ہیں۔ آپ افسانہ نگار سے زیادہ شاعر کی حیثیت سے مدراس کی فضا میں کافی مقبول ہیں۔ حضرت کاوش بدری کی معیت میں آپ بھی اردو ادب کی دنیا میں بہت زیادہ ہنگامے برپا کر چکے ہیں۔

محی الدین عارف (1934-1967):- موصوف کی شخصیت اور آپ کا فن دونوں تمل ناڈو کی اردو دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ یہ وہ زندہ دل فن کار ہے جس سے اردو کی تنقیدی دنیا کے بہت سے امکانات وابستہ تھے لیکن افسوس ہے کہ عین جوانی میں ملک الموت کی دعوت پر اس نے اردو دنیا کو آخری سلام کیا۔ ہنگامی مضامین لکھنے میں موصوف کو کمال حاصل تھا۔ کئی ایک تنقیدی مضامین'' شعلہ وشبنم'' دہلی میں شائع ہو چکے ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ماہ نامہ'' جل ترنگ'' کی ادارت سنبھالی اور کئی علمی اور ادبی ہنگامے برپا کیے۔ تمل ناڈو کے بعض رسائل کے پس منظر میں نیک نیتی سے ادارتی فرائض انجام دینے والی باغ وبہار شخصیت کا ایک نام عارف مدراسی بھی تھا۔

راز امتیاز (-1934):- آپ تمل ناڈو کے ممتاز صحافی قد آور شاعر اور منفرد نثر نگار ہیں۔ آپ نے اردو ادب کو وہ سب کچھ دیا جو ایک حساس اور آفاق گیر قلم کار دے سکتا ہے۔ آپ کی تحریروں میں متانت، ذہانت اور وضعداری کے نقوش بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ آپ نے اردو ادب کے جس موضوع کو بھی چھوا ہے اس کا حق ہی ادا نہیں کیا بلکہ اس موضوع کو نور علی نور بنا دیا ہے۔ افسانوی ادب بھی موصوف کی ذہنی وسعتوں سے بھرپور آشنا ہے۔ آپ کی صحافتی خدمات کا اعتراف بھی ادبی اور سرکاری طور پر کیا جا چکا ہے'' ہندستانی اردو صحافت'' پر آپ کا مضمون (روز نامہ ''علمبردار'' بنگلور، مطبوعہ 1984) تا قیامت تاریخ اردو صحافت میں اپنے روشن خدوخال کے ساتھ یاد رہے گا۔

اعجاز شاکری (-1934) اور کاظم نائطی (-1938):- ان دونوں حضرات کے نام اور کام تمل ناڈو کے اردو ادب میں بہت معتبر مقام رکھتے ہیں 1975 سے 1981 تک جو جمود اور سکوت تمل ناڈو کی ادبی فضا پر چھایا ہوا تھا۔ اس کو توڑنے اور ہفت روزہ ''اتحاد'' کے ذریعہ شعری اور نثری فضا کو دوبارہ معطر و منور کرنے میں خاص رول ادا کیا ہے۔ ان دونوں حضرات کی ایما پر راقم الحروف اور حسن فیاض کو اپنے اپنے تخلیقی جوہر دکھانے کے مواقع بھی نصیب ہوئے۔ تمل ناڈو کے اس دور کو واقعی اردو ادب کا جلوہ فشانی دور کہا جا سکتا ہے۔ ان دونوں حضرات کے ادبی اور تنقیدی مضامین، سوانحی خاکے اور افسانے روز نامہ'' اتحاد'' مدراس، روز نامہ'' سالار'' بنگلور میں جگہ پا چکے ہیں۔ خاص طور پر راقم الحروف کے فن اور شخصیت کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے لکھی ہوئی کتاب'' لہجہ تراش'' کاظم نائطی کی فکری، علمی اور تنقیدی صلاحیتوں کی پہچان بن چکی ہے۔ اعجاز شاکری کے تبصرے اور صحافتی مضامین بھی ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ جن کو اردو ادب کے محقق کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

ایس ایم حیات (1937-1987):- آپ ایک خاموش طبع مگر خوش فکر نثر نگار تھے۔ آپ نے ابتداءً طبع زاد افسانے لکھے اور بعد میں تراجم کی طرف مائل ہوئے تو بس اسی کے ہو رہے۔ تمل، ملیالم، بنگالی اور اُڑیا زبانوں کے شاہکار افسانوں کا ترجمہ اردو زبان میں اس اچھوتے انداز میں کیا ہے کہ ترجمہ پر تخلیق کا گماں ہونے لگتا ہے۔ ہندو پاک کے افسانوی ادب میں آپ کی ایک خاص شناخت قائم ہو چکی ہے۔ آپ کے تراجم ہندو پاک کے کثیر الاشاعت رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے تراجم کا ایک مجموعہ'' ویٹنگ روم'' 1 فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومتِ اتر پردیش کے مالی تعاون سے شائع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔

رشید مدراسی (1937-1987) اور عابد صفی (-1938):- یہ دونوں تمل ناڈو کے نمائندہ اور صفِ اول کے افسانہ نگار ہیں۔ رشید نے افسانوں کے علاوہ دو ایک ناول بھی لکھے ہیں۔ ان کا ایک ناول'' ہیرو'' مشورہ بک ڈپو، دہلی سے منظر عام پر آچکا ہے۔'' ہیرو'' کے بعد موصوف کے ایک اور ناول کا مسودہ راقم الحروف کی نظر سے 1961 میں گزر چکا ہے۔ رشید کی زبانی یہ جان کر بے حد دکھ ہوا کہ شمال کے کسی اشاعتی ادارے نے ان کا یہ ناول غبن کر لیا ہے۔ رشید کے افسانوں اور ناولوں کا کینوس (Canves) بہت وسیع اور کشادہ ہوتا تھا۔ بالخصوص ان کے افسانوں کے کرداروں کا۔ یہ عابد صفی کے افسانوں کے ہلکے پھلکے سطحی موضوعات میں زندگی کی بعض سچائیوں کا رس اور تلخیوں کا عکس نمایاں ہوتا ہے موصوف اپنے بہترین رسوخ اور اعلا سندوں کے بل بوتے پر اردو ماحول میں

جینے کے گُر سے واقف ہیں۔ ہنوز چور دروازوں سے اردو ادب کی بارگاہ میں داخل ہونے کی مسلسل کوشش میں ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے؟

آر۔ کے۔ حسینی :- آپ شہر مدراس کے ماحول کے خاص الخاص ادبی ماحول میں ناول نگار کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ کا ناول ''ننگا ماحول'' 1958 میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔ اس ناول میں حسینی نے عورت کی بے بسی اور جنسی گمراہی کے خدوخال بڑے بہترین انداز میں اجاگر کیے ہیں۔ اس ناول کی اشاعت کے بعد آپ ممبئی کی فلمی دنیا کی طرف رجوع ہوئے اور آج تک اس دنیا سے باہر نہ نکل پائے۔

مہر طلعت آمبوری، امیر النساء :- یہ دونوں فنکار تمل ناڈو کی بہترین افسانہ نگار ہیں۔ مہر کے افسانے ہندستان کے مقتدر رسائل میں جگہ پا چکے ہیں۔ انسانی نفسیات پر مہر نے بڑی گہرائی اور ژرف نگاہی سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے برعکس امیر النساء نے اپنے معاشرے کی برائیوں کی نقاب کشائی بڑے تیکھے انداز میں کی ہے۔ موصوفہ کے افسانوں کا مجموعہ ''بند کتاب'' ابھی ابھی منظر عام پر آیا ہے۔

انور ربانی اور حسن فیاض (1941) :- ان دونوں فن کاروں نے افسانوی ادب کی دیواروں پر چند ایسی ان دیکھی تصویریں چسپاں کی ہیں۔ جن کے کاغذ پیرہن کے نقوش اردو ادب میں ہمیشہ جاوداں رہیں گے۔ ان دونوں افسانہ نگار کی سوچ سے جو نئی کرنیں پھوٹی ہیں وہ کاغذی دنیا کو روشن ہی نہیں کرتیں بلکہ ان کے افسانوں کے قارئین کو نئے افسانے کے مزاج، نئی کیفیت، نئے زاویے اور نئی آفاقی وسعتوں سے بھی آشنا کرتی ہیں۔

حبیب اللہ شاہ مدراسی (1943) :- آپ نے جس سنجیدگی اور متانت کے ساتھ طالب علمی کے دور میں ادب کے میدان میں قدم رکھا آج بھی اسی نیک نامی کے ساتھ شہر مدراس کی ادبی فضا میں مشہور و معروف ہیں۔ تمل ناڈو کے اہم ترین شعرا پر آپ کے سوانحی خاکے سالنامہ ''فانوسِ خیال'' مدراس میں شائع ہو چکے ہیں۔ چند سال پہلے اپنے پیر و مرشد حضرت حافظ سید حبیب محمد حسن القادری چشتی کی زندگی کے واقعات اور مدراس کی اس عظیم ترین متبرک شخصیت کے کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے ایک ضخیم کتاب ''حیاتِ قلندری'' ترتیب دی ہے۔ موصوف کی یہ تالیف ان کی بہترین صلاحیتوں کی غماز ہے۔

فیاض حسین (-1943)، فضل جاوید (-1945) اور فخر اعجاز :- ان تینوں حضرات کو تمل ناڈو کا افسانوی ادب ہمیشہ یاد رکھے گا حالانکہ انھوں نے بہت کم افسانے لکھے ہیں مگر جو کچھ بھی لکھا ہے، ادب کی بارگاہ میں ایک حسین تحفہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان تینوں افسانہ نگاروں کے افسانے مدراس کے جرائد اور کتب مثلاً ''گل نو'' (مطبوعہ 1967) ''روشنی کے بھنور'' (1967) پریسیڈنسی کالج، مدراس کے سالنامہ ''ضیا'' (مطبوعہ 1963 تا 1965) وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ فیاض اور جاوید کے افسانوں میں ہمارے معاشرے میں سانس لینے والی برائیوں کا عکس بڑے انوکھے انداز میں پایا جاتا ہے۔ فخر اعجاز کی ذہنی اور علمی تربیت حالانکہ مدراس کے ماحول میں ہوئی لیکن ان کے افسانے کشمیر کی حسین وادیوں اور جھرنوں کے مدھر گیتوں کے ساتھ ساتھ شملہ کی کوہستانی فضاؤں سے باتیں کرتی ہوئی خوشگوار خوشبو سے لیس ہوتے ہیں۔

صلاح الدین برق (1944) :- تمل ناڈو کا وہ اہم ترین فن کار ہے جس نے نہ صرف اردو افسانوی ادب کو اپنی ذہنی تجلیات سے منور کیا بلکہ تراجم سے اردو زبان وادب کے خزانے کو بھی مالا مال کیا ہے۔ خاص طور پر خلیل جبران کے تراجم اردو زبان میں پیش کرنے کا اعزاز برق کو حاصل ہے۔ موصوف کے تراجم کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اُن تراجم کو پڑھتے وقت قاری کے رگ و پے میں شعری آہنگ اور کلاسیکی رچاؤ کا احساس جمالیاتی کرنیں بکھیرنے لگتا ہے۔

غیاث اقبال (1992-1944) :- آپ تمل ناڈو کے باشعور و باصلاحیت نقاد اور نثر نگار تھے۔ آپ کی نثر شہر مدراس کے تمام نثر نگاروں سے مختلف ہے۔ اس طرح کی اسلوبیاتی نثر ہندستان کے دو تین نثر نگاروں کے حصے میں آئی ہے۔ آپ کی تحریروں میں علمیت کے ساتھ ساتھ ثقالت کی احساس قاری کے ذہن و دل کو اثر انگیزی سے باز رکھتا ہے۔ ہند و پاک کے اکثر و بیشتر جرائد میں موصوف کی نگارشات شائع ہوتی رہی ہیں۔

شعیب احمد کاف (1991-1955) :- شعیب احمد کاف تمل ناڈو کی سرزمین سے بڑی سرعت اور بلند حوصلگی کے ساتھ اُبھرنے والا فن کار ہے۔ چند ہی سال کی مشق و مزاولت سے ہند و پاک کے بہترین رسائل پر چھا جانے والی اور افسانوی ادب سے کم عمری میں روٹھ جانے والی باغ و بہار شخصیت کو اردو ادب کی دنیا ہمیشہ یاد رکھے گی، موصوف نے اپنے اکثر افسانوں میں روز مرّہ زندگی میں وقوع پذیر واقعات کا عکس بڑے روشن اور نمایاں انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ اپنی بات کو بڑے دل کش اور خوش نما اظہار میں قاری تک پہنچانے کے فن سے شعیب بہت خوب واقف تھے اور یہی گُر ان کی کامیابی کی روشن دلیل ہے۔

متذکرۂ بالا نثر نگاروں کے بعد راقم الحروف کا خیال ہے کہ تمل ناڈو میں اردو نثر کے ایک دور کا اختتام بڑے شان دار پیمانے پر ہوا ہے اور اس دور میں جو بھی علمی، ادبی، تنقیدی اور تالیفی کام ہوا ہے وہ تمل ناڈو کے اردو ادب کا بہت تابندہ اور درخشاں دور ثابت ہوا ہے، 1950 سے 1990 کے درمیان تمل ناڈو میں تصنیف و تالیف کا کام بھی خوب سے خوب تر ہوا ہے۔

آج کل نئے لکھنے والوں کی کھیپ میں افتخار حیات، سجاد ظہیر، قاضی حبیب احمد، امین الماس، احمد ندیم اور سجاد بخاری وغیرہ اہم ہیں۔ جو شہر مدراس کے ادبی افق کو اپنی تخلیقی کد و کاوش سے اور اردو نثر کو نئی روشنی، وسعت اور کشادگی کی مہک سے معطر کرنے کی کوشش میں مشغول ہیں۔

□□□

"Noor-e-Janub"
26, Ameerunnisa Begum st.,Chennai-600 002

رتن ناتھ سرشار

("فسانۂ آزاد" جلد اوّل سے اقتباس)

لکھنؤ

لکھنؤ میں میاں آزاد خانہ برباد، اور حضرت خوجی افیونیوں کے مسلم الثبوت استاد نے دو دن پڑاؤ ڈالا اور شہر کے دو مختلف مقاموں پر ایک ایک شب بسیرا لیا۔ پہلی شب آغا میر کی سرا میں بسر کی۔ چوک سیر کو گئے تو دیکھتے کیا ہیں کہ دورویہ بازار آراستہ۔ دکانیں قرینے سے سجی سجائی۔ اشیا سلیقے سے چنی چنائی۔ حلوائی کی دکان شہد و شکر کی کان۔ تھالوں میں مٹھائی اور اس پر ورق نقرہ۔ گاہک پر گاہک آرہے ہیں۔ ایمی پر ایمی نونے پڑتے ہیں۔ گوٹے والوں کی دکانوں پر بھیڑ بھڑکا ہے۔ کوئی لالہ سے مول تول کرتا ہے۔ کوئی منیب جی سے چکاتا ہے۔ صرّافے میں کھناکھن اور چھناچھن، کی آوازیں آتی ہیں۔ دور تک دکانوں کی قطار ہے۔ ہر دکان میں اشرفیوں کا انبار ہے۔ اور جو ہے وہ کامل عیار ہے۔ زبانِ حال و قال سے پکار رہے ہیں کہ شرف الانسان بالمال للبا لکمال۔ دلالوں کی چاندی ہے۔ دو ایک گاہک مل گئے تو پورہ ہیں۔ بازار بھر میں کھڑے چکر لگا رہے ہیں۔ اس سرے سے اس سرے تک تاکتے جا رہے ہیں۔ جوہری کے دکانچہ جواہر نگار میں جواہرات کے ڈھیر لگے ہیں۔ لالہ پنا مل کے دماغ ہی نہیں ملتے۔ جواہر رنگا رنگ اور گوہر شاہوار، دلالی آبدار، دیکھ کر میاں آزاد کی آنکھیں کھل گئیں۔ لعلِ گرانمایہ کے نور و ضیا سے چکا چوند کا عالم ہے۔ کہیں یاقوت رمانی، کہیں زمردِ سبز ریحانی، بزاز سراپا ناز کی دکان پر وہ متاعِ دلفریب ہے کہ واہ جی واہ۔ انگریزی، ہندستانی، شربتی، جامدانی، جس قسم کا کپڑا چاہو لے لو۔ چھینٹ، ڈوریہ، اطلس، قاقم، سنجاب، بانات ہر قسم کا کپڑا موجود مگر بابا مول دس روپیہ گز کہیں تو تین روپیہ گز بیچیں، شانے سے شانہ چھلتا تھا۔ بادِ صبا کو بھی دقت سے بار ملتا تھا۔ کمروں کی طرف جو نظر کی تو بشاش ہو گئے۔ مگر میاں آزاد، اپنے دل میں سوچے کہ بھئی یہ تو خلافِ تہذیب ہے۔ اس بازار سے آپ کو جلد نکال دینا چاہیے۔ ان کے لیے تو ایک بازار خاص ہونا لازم ہے کہ لوگ وہاں جاتے ہوئے شرمائے اور مارے خوف و لحاظ کے وہاں جانے سے باز آئیں۔ مسجدوں کو دیکھا تو چھتیں پھٹی پڑتی ہیں۔ ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع ہیں۔ نمازی تلاوتِ قرآن میں مصروف۔ خیر اس طرف کے لطف تو انھوں نے خوب اٹھائے۔ اب دوسری شب کو امین آباد کی سرا میں آئے۔ اللہ اللہ کیا شہر عذار ہے۔ کوسوں تک آباد کروڑوں مکان، پدموں آدمی، سنکھوں باشندے اللہ اللہ! اور لوگ کہتے ہیں کہ شاہی میں اور بھی زیادہ آبادی تھی۔ اب تو گول دروازے کے سامنے صاف شفاف میدان ہے۔ اور ادھر ادھر اکثر محلے ویران، اجڑے ہوئے مکانات گرے پڑے، مگر ہاں صدر کی طرف خوب گلزار ہے۔ صدر بازار اور امین آباد میں وہ رونق ہے کہ وہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ مکانات بھی عمدہ اور پختہ بنے ہیں۔ عمارات عالیشان، بنگلے صاف شفاف، اور باغ اس کثرت سے ہیں کہ اس سرے سے اس سرے تک باغ ہی باغ نظر آتے ہیں۔ سکندر باغ سبزہ زار ہی سبزہ زار ہے۔ بادشاہی باغ سراپا بہار ہے، جس طرف نکل جائیے باغ کثرت سے پائیں گے۔

الغرض میاں آزاد اور خوجی نے یہاں خوب لطف اٹھایا۔ ہمارے رنگیلے جوان میاں آزاد اور ان کے سیلانی یار جانی میاں خوجی خانہ برباد نے لکھنؤ میں خوب سیر گشت کی۔ خصوصاً لکھنؤ کی عالیشان کوٹھیاں، اور خوشنما دلکشا بنگلے، اور شاہی ایوان سپہر توامان اور گلزار رشکِ فرخار، اور مہوشانِ طرحدار، اور جوانانِ طناز، باغ و بہار، اور امرا کی بارہ دریاں، ایسی بھائیں کہ عش عش کرنے لگے۔ محمد و طبلچی کو طبلہ بجانے میں استاد پایا، تو خوش الحانی میں صادق علی خان کو باربد نژاد پایا۔ بابا جی نے وہ ستار بجایا کہ تان سین کو انگلیوں پر نچایا۔ فرنگی محل ہے یا خطۂ یونان۔ یا علما فضلا کی کان۔ جو عالم ہے مُلّا کی جان و روح۔ معزز و ممدوح۔ مفتی سیر محمد عباس صاحب قبلہ کی مصنفات مسلمات کی عرب تک دھوم ہے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ اور کربلائے معلّٰی اور مشہد مقدس تک کے بلغا آپ کے کلام فصاحت فرجام کی داد دیتے ہیں۔ ایک ایک فقرے پر احسنت و مرحبا کہتے ہیں۔ جو بلیغ ہے۔ امراء القیس ثانی ہے۔ رشکِ جالینوس یونانی ہے۔ اطبا میں ایک سے ایک برق حکیم مرزا محمد جعفر کی طبابت کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ ہوالشافی نسخے میں لکھنے نہ پائے کہ مریض نے صحتِ کامل پائی اور شفائے عاجل حکیم سید محمد خان صاحب کے مجربات علوی خان دہلوی کے مجربات سے کم نہیں۔ معقولات میں استادِ مسلم الثبوت خوش مذاق، زندہ دار، سعادتمند اور معقول پسند آدمی ہیں۔ حکیم مرزا محمد حسین صاحب اور حکیم ابراہیم صاحب کے گھرانے نے وہ دستگاہ کامل بہم پہنچائی کہ اودھ بھر میں شہرت پائی۔ دور دور تک نام ہوا جو مریض ان سے رجوع لایا فائز بمرام ہوا۔ شعرا بھی باکمال ہیں، تدبیر الدولہ مفتی ظفر علی خان اسیر لکھنوی اصنافِ سخن پر قادر، علمِ عروض کے ماہر، بڑے شاعر عز اخند ان۔

● "فسانۂ آزاد" کلاسیکی اہمیت کی حامل کتاب ہے۔ فنی اعتبار سے یہ داستان اور ناول کے درمیان کی تخلیق ہے۔ "فسانۂ آزاد" نہ صرف زبان و بیان اور معاشرے کی عکاسی کی وجہ سے بلکہ اپنے دلچسپ کرداروں کے اعتبار سے بھی پرکشش ہے۔ قومی اردو کونسل نے حال ہی میں "فسانۂ آزاد" کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا ہے۔

بے ہمتا ملک الشعرا ہیں، اگلے شاعروں میں اب یہی تو باقی رہ گئے۔ خدا خضر والیاس کی عمر عطا کرے! گو بوڑھے ہوگئے مگر طبیعت جوان ہے۔ ایک ایک شعر سے سچا لطفِ شاعری ٹپکتا ہے، جو سنتا ہے احسنت و مرحبا کہتا ہے، اور دادِ سخن دیتا ہے۔ آفتاب الدولہ قلق اس زمانے میں غنیمت ہیں۔ ناسخ، میر، ورد مغفور کا نام انھوں نے خوب روشن کیا۔ مثنوی فصاحت محتوی وہ تصنیف کی کہ قلم توڑ دیے۔ کیا صاف روزمرّہ، کیا طرزِ بیاں ہے۔ کیا بول چال، کیا زبان ہے۔ محمد جان شاد بھی بول چال اور روزمرّہ کے استاد ہیں۔

الغرض جس گلی کوچے کو دیکھتے ہیں، کانِ علم جانِ علم، روح و روانِ علم ہے۔ چوک میں جو سیر کرنے گئے تو بے اختیار بول اٹھے:

خدا آباد رکھے لکھنؤ کو پھر غنیمت ہے
نظر کوئی نہ کوئی اچھی صورت آ ہی جاتی ہے

ایک دن پہلوانوں کی کشتی اور پٹیتیوں کی دھینگامشتی اور پکیتوں کی کثرت اور پھینکیتوں کے کرتب اور بنوٹیوں کے کمال دیکھے، تو گردن ہلائی کہ ہاں ابھی بانکوں سے لکھنؤ خالی نہیں ہے۔ گتکہ پٹکا، اور یہ ہور ہے۔ گتکہ پٹکا، اور وہ اچک گئے۔ تراش خراش کا بھی لکھنؤ پر خاتمہ ہے۔ یہاں کی مشاطگان چابک دست کی قسم کھانی چاہیے۔ وہ گر یاد ہیں کہ واہ جی واہ۔ ہندستان کا فرانس لکھنؤ ہے۔ وہاں مہینے میں ایک فیشن بدلتا ہے، تو یہاں ہفتے میں پانچ۔ میاں آزاد اور خوجی لطفِ تماشا دیکھتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ اثنائے راہ میں ایک صاحب نئی وضع اور انوکھی قطع کے نظر سے گزرے۔ حیرت ہوئی کہ الٰہی یہ کس فیشن کے آدمی ہیں۔ بالکل نئی گڑھت ہے۔ اب ان حضرت کی قطع ملاحظہ فرمائیے۔ از سرتا پا زرد از رو، ڈھیلے پائچوں کا پاجامہ، زعفرانی کپچل لیٹ کا تین کرتوئی والا، انگرکھا کیسری۔ دوپلی ٹکّے دار ٹوپی۔ بسنتی کاندھوں پر بہت بڑا جھپکیے کا رومال، عشاقِ زار کے چہرے کی رنگت اور ان سب میں لچکا ٹکا ہوا۔ ماشاء اللہ سن شریف چہل وشش۔ نازم باین ریش وفش۔

آزاد: کیوں بھئی خوجی، بھلا بھانپو تو یہ کس ولایت کے ہیں؟

خوجی: خراسانی سے معلوم ہوتے ہیں۔ یا کابل کے ہوں۔

آزاد: کابلیوں کی یہ قطع کہاں۔

خوجی: واہ خوب سمجھے۔ ارے میاں کیا کابل میں... نہیں ہوتے؟

آزاد: (قہقہہ لگا کر) ذرا حضرت کی چال تو دیکھیے گا۔ کیسے کندے جھاڑتے ہوئے، پوقدے چلے جاتے ہیں۔ کبھی پاپوش زریں ٹاٹ بانی اوگی پر نظر ہے۔ کبھی رومال پھڑ کاتے ہیں۔ کبھی انگرکھا چکاتے ہیں۔ کبھی لچھے کی جھلک دکھاتے ہیں۔ چمکتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ اس ڈاڑھی موچھ کا بھی خیال نہیں۔ یہ لمبی ڈاڑھی، خرگوش کی جھاڑی، اور یہ لچکے کی گوٹ۔ لاحول ولاقوۃ۔

خوجی: آپ کو واللہ ذرا چھیڑیے تو دل لگی ہی سہی۔

آزاد: یا حضرت آداب عرض ہے! واللہ آپ کے لباسِ فاخرہ پر تو وہ عالم ہے کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی ہے۔ پائے نظر پھسلا جاتا ہے۔

زرد پوش: (شرما کر) جی ایک وجہ خاص ہے۔

آزاد: وجہ خاص کیا؟ کیا کسی سرکار سے وردی ملی ہے۔ یا سچ کہنا استاد کسی نائی سے تو نہیں چھین لائے ہو؟

زرد پوش: (اپنے خدمت گار سے) رمضانی ذرا بتا تو دینا۔ ہمیں اپنے منھ سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔

رمضانی: حضور میاں کا نکاح ہونے والا ہے۔ مانجھے کے کپڑے پہنے ہیں۔ رسم ہے حضور!

آزاد: لاحول ولاقوۃ۔ رسم کی ایک ہی کہی۔ کہاں کی رسم، کہنے لگے رسم ہے۔ واہ اچھی رسم ہے۔ یہ بدعت ہے یا رسم ہے، ڈاڑھی موچھ والے آدمی، اور لچکا بنت پٹھا لگا کر کپڑے پہنے ہیں۔ معاذ اللہ یہ بھائی دلہن کے لیے ہیں، یا آپ سے مچھا کر بیگ کے لیے۔ واسطے خدا کے ان کپڑوں کو اتارو۔ مردوں کی پوشاک پہنو۔ لاحول ولاقوۃ۔

زرد پوش: یہ تو سب ہی پہنتے ہیں۔

خوجی: ذری ہم سے تو چار آنکھیں کیجیے۔ ہاں صاحب کون سب پہنتے ہیں؟ آخر آپ نے کن سب کو دیکھا ہے؟ ہم کو سکھاتے ہو۔ تمھارے ہی سے دو چار زنانہ منتری پہنتے ہوں گے، ورنہ باوضع اور سنجیدہ اور متشرع لوگ تو ایسی وضع کے قریب جانا داخلِ گناہ سمجھتے ہیں۔

آزاد: ارے یار تم کو شرمانا چاہیے، یا بڑانا چاہیے۔ استغفر اللہ! آپ اکڑتے جاتے ہیں۔ شاباش، بے حیا کی بلا دور۔

میاں آزاد اور خوجی آگے بڑھ گئے۔ اور حضرت زرد پوش اور ان کا خدمت گار صاحب تن و توش، ایک گلی میں کترا گئے۔ تو راہ میں خدمت گار نے یوں سمجھانا شروع کیا۔

خدمت گار: میاں سچ تو کہتے تھے۔ ذری دل میں سوچیے تو جس گلی میں کوچے میں آپ نکل جاتے ہیں، لوگ تالیاں بجاتے ہیں۔ انگلیاں آپ پر اٹھاتے ہیں، اور قہقہہ لگاتے ہیں۔

زرد پوش: ہنسنے دو جی۔ ہنستے ہی گھر بستے ہیں۔ من ضحک ضحک۔

خدمت گار: آپ تو عربی بھی پڑھے ہیں، میں جاہل آدمی ہوں۔ مل بُری بات بُری ہی بات ہے۔ ہم غریب آدمی تو ایسے کپڑے پہنتے ہی نہیں۔ اور آپ لوگ رئیس اور پڑھے لکھے مُل۔

زرد پوش: مُل ڈل میں نہیں جانتا۔ تم غریب غربا ایسے کپڑے لاؤ

کہاں سے، جو پہنو۔ اچھا چل کر میاں سے پوچھیں گے۔ دیکھیں بھلا کیا کہتے ہیں وہ تو ثقہ اور مُسن ہیں، جو کہیں وہ منظور۔

خدمت گار: اچھا ہزار بات کی ایک بات تو آپ نے یہ کہہ دی، لیجیے گھر بھی آ گیا۔ اور بڑے صاحب بھی ٹہل ہی رہے ہیں۔

زرد پوش: ابا جان آج ہم کو ایک بدمعاش رُلا رُلا دیا۔

پیر فرتوت: کون بدمعاش؟ تم نے کچھ چھیڑا ہوگا، ایک ہاتھ سے تو تالی بجتی ہی نہیں۔ اہاہا۔ میں سمجھا اس تمھاری انوکھی قطع پر تو کہیں نہیں ہنسے، بھئی ہم بھی ان سے متفق ہیں۔ ہم خود تم سے کہنے کو تھے کہ بیٹا اس وضع کو نہ اختیار کرو، مگر ہم تمھاری اماں سے بہت ڈرتے ہیں۔ وہ بڑی تنک مزاج ہیں۔ ہم کو تو ذرا ذرا سی بات پر لے ہی ڈالتی ہیں۔ سو بھئی اگر تمھارا جی چاہے تو ان کپڑوں کو اتار ڈالو، اگر نہ اتارو تو باہر نہ جاؤ، ورنہ مفت میں اپنے کو ہنسوانا کون سی دانائی ہے۔

میاں آزاد اور میاں خوجی راہ میں باہم قہقہہ اڑاتے اور رسومِ مذمومِ ہند پر نفریں کرتے اور لاحول پڑھتے ہوئے جا رہے تھے۔ تو ایک وضع دار اور طرح دار جوان سے انھوں نے پوچھا، کیوں حضرت، جب آپ کی شادی ہوئی تھی تو زرد کپڑے آپ نے بھی پہنے تھے؟ اس نے کہا لاحول ولاقوۃ، یہ زنان منتریوں کو مبارک رہیں۔ یہاں دو انگل ہر دم میان سے باہر رہتی ہے۔ آپ نے کسی زنان منتری کو دیکھا ہوگا۔ کہیں کسی اور سے یہ سوال نہ کر بیٹھیے گا۔ اور مشفق رسموں کی نہ کہیے بعض آدمیوں کے یہاں یہ رسم ہے کہ دُلہن کا جوتا دولھا کی کھوپڑی پر تڑ سے لگاتے ہیں۔ جو دولھا ثقہ ہوا تو خیر جوتی چھوا دی، اور جو وہ بھی تُھسمول، ہنسوڑ بگڑے دل، ہوئے تو پھر وہ اور ان کا سر، اور گرگابی، مگر بانکے آدمی تو سر کاٹ کر پھینک دیں۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ڈکڑی سامنے سے آ رہی ہے۔ بڑی بیش بہا فٹن، دو کمیت، دو رکابی گھوڑیاں جُتی ہوئی ہیں۔ دونوں برق۔ ہوا پیچھے رہے، وہ آگے جائیں۔ شیر گردوں کو طرّارہ بھر کے ٹاپیں مار آئیں۔ کوچ مین سبز مندیل کھوپڑی پر جمائے ہوئے، کوچ بکس پر بیٹھا ہوا ہائٹ ہائٹ کر رہا ہے، اور تین نوجوان رئیس بڑے تھے، اور کرّ و فر سے بیٹھے ہیں۔ تینوں عینک باز تینوں طناز اور خوش انداز۔ شانِ ریاست جبینِ مبین سے عیاں۔ طنطنۂ امارت چہرۂ نورانی سے نمایاں۔ اتنے میں ایک اور بلشٹ بگھی کھڑکھڑاتی ہوئی سامنے سے آئی۔ دو جوان رئیس بصد شان و آن بان متمکن ہیں، مگر دونوں عینک باز سونے کی تیلیاں اور نازک تال، اس کے بعد تین چار گھوڑوں پر سوار جوان اور گلفام نظر سے گزرے۔ کوئی جماتا ہے۔ کوئی قدم دکھاتا ہے۔ کوئی کڑکڑاتا ہے۔ کوئی چپکاتا ہے۔ ان میں بھی دو عینک باز، تب تو میاں آزاد نے کہا کہ کیوں بھیا خوجی یہاں یہ عینک کا فیشن نیا دیکھنے میں آیا۔ جسے دیکھو عینک باز۔ یہ دانا بینا آدمی، اور اندھے بننے کا شوق چرائے۔ بینا سے نابینا بن جائے۔ لاحول ولا۔ خوجی بولے کہ ابھی ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے۔ اس کو بھی جوان عاشق تن ایک سجاوٹ اور بناوٹ سمجھتے ہیں، اور چار دن میں دیکھ لیجیے گا کہ رنگین طبع، آزاد مزاج، عورتیں بھی عینک چڑھانے لگیں گی۔ یہ تو فیشن ہے بھئی۔ یہ بھی وضع داری ہے۔

□□□

حیاتِ جاوید

الطاف حسین حالی

سر سید احمد خاں کے رفیق کار مولانا الطاف حسین حالی کے قلم سے سر سید احمد خاں کی زندگی کے حالات اور ان کی قومی اور مذہبی خدمات کا بیان ــــ

چوتھا ایڈیشن

صفحات: 907، قیمت: 167.00 روپے

اردو ادب کی تنقیدی تاریخ

سیّد احتشام حسین

اردو ادب کی تمام اصناف کا مختصر مگر جامع تعارف، تاریخی حوالوں کے ساتھ

طلبہ کے لیے بطور خاص کارآمد ــــ

چوتھا ایڈیشن

صفحات: 334، قیمت 70.00 روپے

شعریات

ارسطو کی بوطیقا کا ترجمہ اور تعارف

شمس الرحمٰن فاروقی کے قلم سے

ہر ادبی لائبریری میں اس کتاب کی موجودگی ضروری ہے

تیسرا ایڈیشن مع اضافۂ جدیدہ

صفحات: 136، قیمت: 62.00 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

مشیر الحسن

پندرھویں قسط

جان کمپنی سے جمہوریہ تک جدید ہندستان کی کہانی

1857 کے لوگوں نے خود اپنی جس جدوجہد کو "Reigning Indian Crusade" کی حیثیت سے دیکھا تھا وہ عدمِ اتحاد، لیڈرشپ کے فقدان، کم درجے کی جنرل شپ اور کم تر فوجی مہارت کی وجہ سے ناکام ہوئی۔ لوگوں کی آرزوؤں اور تمناؤں کو سیدھی راہ پر لگانے کے لیے نہ تو کوئی نظریہ تھا اور نہ ہی کوئی پروگرام۔ کسانوں کی ہزار سالہ حکومت کا عقیدہ اتنا بھی مشترک پلیٹ فارم مہیا نہ کرسکا جتنا کہ چین میں ہم عصر تائی پنگ بغاوت نے اپنے ابتدائی مدارج میں فراہم کیا تھا۔ ابتدا سے ہی پرانے نظام کے نمائندے بڑی تعداد میں شریک تھے۔

مارکس نے دہلی میں شکست کے اسباب میں رجمنٹس میں اختلاف، ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفرقہ اور سپاہیوں اور تاجروں کے، کہ جنھیں سپاہیوں نے لوٹا تھا، باہمی اختلاف کو قرار دیا۔ نانا صاحب اور رانی جھانسی خودغرض تھے، سندھیا انگریزوں کے پٹھو تھے اور ان کے ساتھ تھے مہاراجہ پٹیالہ جن سے جرمن فلاسفر انگریزوں کے ساتھ ان کی ملی بھگت کے لیے نفرت کرتا تھا۔

پھر بھی یہ شورش محض چند غیر مطمئن عناصر کے لیے ایک موقع نہیں بلکہ یہ عوام کی بغاوت تھی۔ ان کی خاصی بڑی تعداد اسے بہرحال مشترکہ جذبات میں کھلبلی سمجھتی تھی۔ شورش کا کردار اور شورش کا مواد ایک ایسی کشمکش کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اہمیت کے اعتبار سے چھاؤنیوں کی بغاوت سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ کسی انقلاب کا ورثہ نسل کے تحت الشعور میں رہتا ہے۔ اور اُن اسباب کو تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے جو نظر سے اوجھل رہتے ہوئے کسی مقصد کے حصول کے لیے خاموشی کے ساتھ فعال رہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی قومی اقتدار اور خودمختاری کے کسی خیال کے نہ ہونے کے باوجود 1857 کے باغی وطن پرستی کے ان احساسات کے وسیلے سے متحد ہوئے جن کی اساس نسل، مذہب اور کمیونٹی کے قدیم اور مانوس نظریات میں تھی۔ ورثے کی جہاں تک بات ہے تو بغاوت نے بہت سی قابلِ پرستش شخصیتیں پیدا کیں جو بعد کو قوم پرستانہ اساطیر کا حصہ بن گئیں۔ کلکتے کے جوار میں سب سے بڑی چھاؤنی کے قصبہ بیرک پور میں منگل پانڈے، بہار میں کنور سنگھ، بٹھور میں اپنا دربار لگانے والے پونا کے بے دخل حکمران کے بیٹے نانا صاحب، تانتیا ٹوپی اور رانی جھانسی وسطی ہند میں اور فیض آباد کے مولوی احمد اللہ شاہ۔ مولوی صاحب نے جہاد کی تلقین کرتے ہوئے اودھ کے شہروں کا دورہ کیا اور 1858 کے موسم گرما کی مہم میں کولن کیمبل کی فوجوں کو ناکوں چنے چبوادیے۔ ایک لوک ہیرو رانی بنی راؤ مادھو کو میلوں ٹھیلوں کے موقعے پر گائے جانے والے دیہاتی گیتوں میں انتہائی عزت و وقار عطا کیا گیا۔ یہی کیفیت رزمیہ شخصیت رانی جھانسی اور بھوجپوریوں کے باپ کنور سنگھ کی تھی۔ کنور سنگھ کی تاریخی مارچ کے بارے میں انگریزوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

دو انتہائی مقبول لوک گیت ہیں:

خوب لڑی مردانی وہ تو جھانسی والی رانی تھی
توپیں چڑھیں میناروں پر، اگنی بان ہوا میں
اڑتے تھے
خوب لڑی مردانی
سینک کھائیں دودھ ملائی
وہ گئو چاول کھاتی تھی
خوب لڑی مردانی وہ تو جھانسی والی رانی تھی

(انگریزی سے ترجمہ)

اور پھر

اُو بابو کنور سنگھ
ہم نارنگے کپڑے اپنے اب کیسریا رنگ ماں
جب تک راج تمھارا آئے نا
ایک اُور سے آئے فرنگی اور ایک اُور سے کنور بھیّا
دونن کی توپن سے اگنی برسن لاگی
جیسے رنگ اڑے ہے ہولی ماں
گھمسان کا یدھ ہوا رن ماں
اُو بابو کنور سنگھ
ہم نارنگے کپڑے اپنے اب کیسریا رنگ ماں
جب تک راج تمھارا آئے نا

(انگریزی سے ترجمہ)

"کیا یہ صحیح ہے؟" پردیپ نے پوچھا، "کہ ان محبِ وطن لوگوں کے نام سبھاش چندر بوس کی قیادت میں قائم ہونے والی آزاد ہند فوج کے عارضی

گورنمنٹ کے اعلامیے (21 /اکتوبر 1943) میں شامل تھے؟

''ہاں''، عزیز نے جواب دیا،'' پچھلے سال میں شمال مشرقی پنجاب میں فرخ نگر گیا تھا۔ دہلی سے فرخ نگر تک کا یہ سفر خاصا طویل اور تھکا دینے والا تھا۔ اس کی بوقلموں تاریخ اٹھارھویں صدی کی تیسری دہائی کے اوائل سے شروع ہوتی ہے جب مغل بادشاہ فرخ سیر نے ایک بلوچ سردار فوجدار کو وہاں کا گورنر بنایا تھا اور اس نے اس شہر کی بنیاد رکھی تھی۔ ماضی بہرحال عوامی شعور میں طاق نسیاں کی زینت بن گیا۔ اگرچہ وہاں کے لوگ وسیع وعریض شیش محل کے سائے میں ایک پرمسرت زندگی گزار رہے ہیں مگر انھیں اس محل کے تعمیر کرنے والے کے بارے میں کچھ معلوم کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ایک عظیم قلعہ، تصویر میں بڑا اہم ہے۔ مگر وہاں کے باشندوں کو یہ پتہ چلانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ قلعے کی دیواریں اور اس کے دروازے بوسیدہ ہو ہو کر کیوں ٹوٹتے جا رہے ہیں، یا پھر 1757 سے 1764 تک فرخ نگر پر قابض رہنے والے بھرت پور کے جاٹوں کا بنوایا ہوا ہشت پہل کنواں اتنی دانستہ بے توجہی کا شکار کیوں بنا؟

پھر کچھ یادیں پسند اور ناپسند کی بنیاد پر قبول یا رد کردی گئی ہیں، آزادی کی جدوجہد اس علاقے کے بزرگوں کی گفتگو کا پسندیدہ ترین موضوع ہے۔ ان لوگوں نے مجھے وہ کہانیاں سنائیں جو انھوں نے اپنے والدین سے سنی تھی۔ کہانیاں کہ کس طرح گورا پلٹن 1857 کی بغاوت کے چھ مہینوں میں، محض عوام کے انتقامی حملوں کے خوف سے فرخ نگر میں داخل نہیں ہوئی، کس طرح ان کے نواب احمد علی خاں نے بہادر شاہ ظفر کو پیسے اور گولے بارود کی پیش کش کی اور کس طرح بالآخر انگریزوں نے ان کو نیچا دکھایا۔ ان لوگوں نے تفصیل کے ساتھ بتایا کہ کس طرح انگریز فوجی دستے لال دروازے سے فرخ نگر میں داخل ہوئے، کس طرح نرغے میں پھنسے ہوئے نواب کو انھوں نے گرفتار کیا، دہلی تک کا سات میل کا راستہ کس طرح ان سے پیدل طے کرایا اور کس طرح بلبھ گڑھ کے راجہ ناہر سنگھ اور جھجھر کے سردار کے ساتھ نواب صاحب کو بھی تہہ تیغ کیا''۔

''یہ سب تو ٹھیک ہے، مگر لکھنؤ میں کیا ہوا؟'' جگ موہن نے پوچھا۔

''ہاں، دلیری اور شجاعت کی کہانیاں جو کانوں میں پڑتی ہیں، آزادی کے لیے جان دینے والوں کی یادگاریں جو خود ہمارے شہر میں ہیں''۔ پردیپ نے اضافہ کیا۔

ایک سو چالیس دنوں تک چلنے والے لکھنؤ کے محاصرے کو یاد کرتے ہوئے عزیز نے تیس مئی کے بعد باغیوں کی مسلسل پیش رفت اور اس کے بعد معزول واجد علی شاہ کے ایک نوجوان بیٹے برجیس قدر کے بادشاہ ہونے کے چھٹے اگست کے اعلان کا حوالہ دیا۔ اس کے بعد طوفان کا رخ بدلنے لگا۔ نئے کمانڈر ان چیف، گلاسگو کے ایک بڑھئی کے لڑکے کولن کیمپبل نے 16 رنومبر کو لکھنؤ واپس لیا اور دوسرے دن ریسیڈنسی کو آزاد کرالیا۔ کانپور میں تانتیا ٹوپی کو شکست دینے کے بعد کیمپبل اپنی فوجی کارروائی کو مکمل کرنے کے لیے لکھنؤ واپس آیا۔ 22 مارچ کو اس نے باغیوں کے آخری دفاع کی سرکوبی کردی، مارچ 1858 میں ریسیڈنسی کے کھنڈرات پر یونین جیک لہرا دیا گیا۔

مارکس نے کیمپبل کی مہم کی توانائی اور دانش مندی کو تو سراہا مگر باغیوں کے رویے کی تعریف نہیں کی۔ اس نے لکھا کہ ''لال کوٹ'' والوں کا نظر آنا ہی انھیں ہر جگہ خوف وہراس میں مبتلا کردیتا تھا۔ مارکس کے اس خیال کا، دوسری دہائی میں شرر کے اس خیال سے موازنہ کیجیے کہ محاصرہ کرنے والے شہر کے بدنام عناصر اور بے اصولے سپاہیوں پر مشتمل تھے۔ ان میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں تھا جو جنگ کے اصولوں کی ذرا سی بھی واقفیت رکھتا ہو یا بکھری اور منتشر فوجوں کو یکجا کر کے انھیں ایک منظم حملہ آور فوج میں تبدیل کرسکتا ہو۔ عوام ملکہ حضرت محل کی کارکردگی اور ان کی خوش نیتی کی تعریف کرتے تھے مگر ان کے مشیروں کو نااہل اور ان کے سپاہیوں کو ناکارہ سمجھتے تھے۔ اپنی خود غرضی اور مفاد پرستی کی وجہ سے ان میں سے کسی نے کسی دوسرے کی نہ کوئی بات سنی نہ کسی کا کوئی مشورہ مانا''۔

''کیا؟'' پردیپ نے دھیرے سے پوچھا، جیسے اسے یہ خیال ہوا کہ عزیز حوالے کا مطلب صحیح نہیں سمجھ رہا ہے۔

مارچ کے آخر میں مسجدوں، مکانوں اور قبرستانوں کی توڑ پھوڑ کے ساتھ ایک عذاب ٹوٹ پڑا۔ 364 افراد پر مقدمات چلے، 23 افراد کو پھانسی دی گئی، 115 کو شہر بدر کیا گیا، 13 آدمیوں کو تین سال سے کم کی سزائیں ہوئیں، 27 کو کوڑے لگائے گئے، 47 پر جرمانے ہوئے اور 139 کو رہا کردیا گیا۔ 17 رستمبر 1858 کے نیویارک ڈیلی ٹریبون میں اپنے ایک مضمون میں اینگلز نے انگریز فوجی دستوں کی ظالمانہ انتقامی کارروائی پر اظہار خیال کیا تھا۔ افسوس ہے کہ لکھنؤ اب پھر پرانا لکھنؤ نہیں ہونے والا تھا۔ اس تباہ حال شہر کی شام کے اس دھندلکے، ایک تہذیب کے انحطاط اور خود لکھنؤ والوں کی نظروں کے سامنے، ایک مخصوص اندازِ فکر اور ایک مخصوص طرزِ معاشرت کی موت کو بیان کرنے کے لیے ہمیں احمد علی جیسے کسی صاحبِ قلم کی ضرورت ہے''۔

''اور واجد علی شاہ کا انجام؟'' پردیپ نے پوچھا، اس کے لہجے میں سوال بھی تھا اور بیان بھی۔

''اس کا جواب تو میں بھی دے سکتا ہوں''، جگ موہن بول پڑا، ''میں نے کہیں پڑھا تھا کہ معزول بادشاہ نے 13 / مارچ 1858 کو لکھنؤ چھوڑا اور 13 / مئی کو وہ کلکتے پہنچے۔ مٹیا برج میں اپنی پنشن پر زندگی بسر کرتے ہوئے انھوں نے

لاکھوں روپے ماہانہ اپنے پچیس ہزار کبوتروں کی دیکھ بھال اور اپنے حرم میں جو پہلے ہی سے بہت بڑا تھا، مزید اضافے پر خرچ کیے۔ اگر مجھے ان کی موت پر لکھنا ہوتا تو میرے پاس ان کے بارے میں لکھنے کے لیے اچھی باتیں شاید بہت نہ ہوتیں۔ وہ ایک اچھے موسیقار اور ایک اچھے شاعر تھے مگر لائق حکمراں نہیں تھے۔ شاید وہ حالات کے شکار تھے اور ایک فرسودہ، وراثت کے وارث۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اہلِ لکھنؤ واجد علی شاہ کے شرمناک عہد کا ذکر تو بڑے فخر کے ساتھ کرتے ہیں مگر آصف الدولہ کے بارے میں منہ سے ایک حرف نہیں نکالتے ہیں۔

جگ موہن کی آواز میں تمسخر تو نہیں تھا ہاں ایک جذباتی سنجیدگی ضرور تھی۔

عزیز کچھ تھکا تھکا سا معلوم ہوتا تھا۔ اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے ایک لمبی سانس لی، ایک سموسہ کھایا، پائپ کی راکھ جھاڑی اور حالی کے مسدس کے اشعار پڑھنے لگا۔

یہاں ہر ترقی کی غایت یہی ہے
سر انجامِ ہر قوم و ملت یہی ہے
سدا سے زمانے کی عادت یہی ہے
طلسمِ جہاں کی حقیقت یہی ہے
بہت یاں ہوئے خشک چشمے اُبل کر
بہت باغ چھانٹے گئے پھول پھل کر
وہی ایک ہے جس کو دائم بقا ہے
جہاں کی وراثت اسی کو سزا ہے
سوا اس کے انجام سب کا فنا ہے
نہ کوئی رہے گا نہ کوئی رہا ہے
مسافر یہاں ہیں فقیر اور غنی سب
غلام اور آزاد ہیں رفتنی سب

عزیز نے اپنی بات ابھی ختم نہیں کی تھی۔ اس نے 1806 میں ہندستانی فوجی دستوں کی ویلور کی بغاوت کا ذکر کیا جس میں ولیم بینٹنک کو مدراس کی گورنرشپ کی قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔ عزیز نے 1808 کے موسم گرما میں کمپنی کی مدراس آرمی کے افسروں کی ''سفید بغاوت'' (White Mutiny) کا بھی ذکر کیا۔ ویلور مدراس سے تقریباً ساٹھ میل دور تھا۔

داڑھی صاف کرنے والے معاملے سے چوکتے ہوئے کمپنی کے ہندستانی فوجی دستے (سپاہیوں سے پریڈ میں آنے سے پہلے اپنی داڑھیاں کٹوانے، یونیفارم کی ٹوپیاں پہننے اور پیشانی سے تلک وغیرہ چھڑانے کا حکم دیا گیا تھا) 6/ جولائی کو انگریز افسروں اور سپاہیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، انھوں نے تقریباً سو افسروں اور سپاہیوں کو مار ڈالا۔ 1756 میں کلکتے کے سقوط کے بعد برطانوی قوت کو غالباً یہ سب سے گہرا دھکا لگا تھا۔

1806 کے موسم گرما میں شورش کے وقوع سے قبل، لوگوں نے اہم برطانوی ٹھکانوں کے قرب و جوار میں جہاں گشت مذہبی فقیروں کی تعداد میں ایک اچانک اضافہ محسوس کیا۔ ان فقیروں نے خفیہ سوسائٹیاں بنائیں اور لوگوں کو یہ بتایا کہ انگریزوں نے مکاری اور فریب سے ہندستانی علاقوں پر قبضہ کیا ہے، ہر نواب اور ہر راجہ کو معزول کر دیا ہے، خوب دولت کھسوٹی ہے اور عوام کو مفلس بنا دیا ہے، اپنے قانون، اپنے رسوم و رواج اور اپنے مذہب کو جبراً مسلط کر دیا ہے۔ انھوں نے عیسائیوں کی تبدیلی مذہب کی کارروائیوں کا بھی حوالہ دیا۔ ان میں سے بعض نے تو سیرام پور میں بپٹسٹ مشنریوں کی سرگرمیوں پر اور Claudius Buchanan جیسے کمپنی کے چیپلنوں کے ہندو مخالف مناظروں پر خصوصیت کے ساتھ اپنے ردِّ عمل کا اظہار کیا۔ ایک طرف ہندوؤں کا خیال تھا کہ حکومت گائے کا خون ملا ہوا نمک بیچ کر انھیں آلودہ کرنا چاہتی ہے تو دوسری طرف مسلمانوں کو یہ شبہ تھا کہ نمک میں سور کا خون ملا ہے۔ یہ خیالات اور یہ دلائل 1857 کے انقلاب کے اسباب کی واضح بازگشت لگتے تھے۔

عزیز نے بتایا کہ ہندستان میں برطانوی حکومت کے استحکام کا سبب بننے کے بعد عظیم بغاوت کس طرح اینٹی کلائمکس ثابت ہوئی۔ اسے تاریخ کی بوالعجبی کہیے کہ 1857 کے سال نے انگریزوں کے اقتدار پر تکمیل اور قطعیت کی مہر لگا دی۔ یہ ٹھیک ہے کہ انیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائیوں میں اپر انڈیا کے بعض حصوں میں نام نہاد وہابی، تردد کا سبب ضرور بنے رہے مگر انگریزوں کے لیے کوئی حقیقی خطرہ نہیں تھا، نہ کسی بغاوت کی سرکشی کا اور نہ ہی کسی سازش کا۔ رُڈیارڈ کپلنگ کا ہندستان، جس کا پرتو "Kim" (1901) میں نظر آتا ہے، ایک ایسی مصدقہ دنیا تھی جس میں جنگ صرف سرحد پر یا اَپر برما میں جاری تھی۔ اس نے ناول میں تخریبی تحریکوں اور بدیسی سازشوں کو کہانی کے پلاٹ کو زیادہ اشتعال انگیز بنانے کے لیے متعارف کرایا۔ سماج کی ماہیت کو تبدیل کرنے یا اس پر فوقیت حاصل کرنے کا، بہر حال وہاں کوئی سوال نہیں تھا۔ کسی برطانوی سول سرونٹ کے لیے ناول کا ماحول وہی تھا جس میں وہ چودہ برس کی عمر سے ہندستان چھوڑنے تک رہا تھا۔

مگر اس مصدقہ دنیا میں بھی کیا غلط ہوا تھا، سے واقف رہنا اور دوستوں اور خیرخواہوں کے مشوروں پر توجہ دینا ضروری تھا کیونکہ لاپروائی اور بددماغی انگریزوں کو پہلے ہی بہت نقصان پہنچا چکی تھی۔ اس لیے احتیاط اور ضبط کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انگریزوں کی نوجوان نسل پر خصوصاً بغاوت کی تاریخ کو پڑھنا، گرہ میں باندھنا اور یاد رکھنا فرض تھا کیونکہ بغاوت میں بے شمار سبق تھے اور لا

تعداد چھاؤنیاں۔(لارڈ کرومر)

مختصراً یہ کہ پہلا منصوبہ، مفاہمت اور جبر کی ملی جلی پالیسی کے ذریعے سلطنت کے تانے بانے کو از سر نو بنانا تھا۔ کابینہ کے ایک وزیر نے 1892 میں لکھا تھا کہ سو سال تک انگریزوں نے ہندستان میں نیم خدا کی طرح سلوک کیا تھا۔ اس اعتماد میں کوئی کمزوری، انگریزوں کے دماغ میں یا ہندستانیوں کے ذہن میں، احکامات کے لحاظ سے خطرناک تصور کی گئی۔ مگر شہزادے جو خاموش رہے تھے انھیں اس خاموشی کا اجر بھی دینا تھا اور شاہی نظام میں مدغم کرنا بھی تھا۔ نتیجتاً پٹیالہ اور جند کے مہاراجاؤں نے جنھیں زمینوں کے بڑے وسیع وعریض قطعات دیے گئے تھے، شمال مغرب کے راستے عنایت بھی کیے اور انھیں کھلا بھی رکھا۔ کپورتھلا کے راجہ کو دس ہزار روپے اور اودھ میں دو جاگیریں دی گئیں اور ساتھ ہی گیارہ توپوں کی سلامی کا حق بھی۔ بعد کو لٹن (انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں وائسرائے) نے اُن بابوؤں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کا مقابلہ کرنے کے لیے ان لوگوں کی معاونت حاصل کرلی۔ جن کو ہم نے، دیسی اخباروں میں نیم باغیانہ مضامین لکھنا سکھایا تھا۔ زمین داروں کی راج کے دست و بازو کی حیثیت سے ہمت افزائی کی گئی۔ اودھ کے تعلقداروں کو جنھیں کچھ سال پہلے طفیلی بچولیے سمجھا جاتا تھا، از سر نو اپنایا گیا اور ملک کے قدیم، دیسی اور عزیز از جان ادارے کی حیثیت عطا ہوئی۔ اس عمل نے کسانوں کی روز افزوں ابتری میں مزید معاونت کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اے جے ایس کننگھم کو تعلقداروں کو ملنے والی مراعات میں تخفیف کے لیے زبردست اصلاحی اقدامات کی سفارش کرنا پڑی۔

یکم نومبر 1858 کے ملکہ وکٹوریہ کے اعلانیے نے راجاؤں، سرداروں اور ہندستانی عوام سے مذہبی بُردباری اور پرانے حقوق اور رسوم و رواج کو قائم رکھنے کا وعدہ کیا۔ کمپنی کی اتھارٹی جو 1833 سے یوں بھی روبہ زوال تھی، 1858 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ساتھ بالکل ختم ہوگئی۔ اب ہندستان پر لندن ایک سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے وسیلے سے حکومت کرے گا اور اس کی مدد کے لیے پندرہ اراکین کی ایک کاؤنسل ہوگی۔ گورنر جنرل کو وائسرائے بنادیا گیا اور 1861 کے انڈین کاؤنسل ایکٹ کے تحت اس کی کاؤنسل اور ساتھ ہی بمبئی اور مدراس کی کاؤنسلوں کو صرف لیجسلیٹیو مقاصد کے لیے، غیر سرکاری اور یورپین اراکین کی تعداد میں اضافہ کرکے نسبتاً بڑا کردیا گیا۔

کرزن کو اس انتہائی پیچیدہ اور دوہرے ڈھنگ کے انتظامی روپ پر جس میں دو سربراہ (Chiefs) تھے، بڑی حیرت تھی۔ لندن میں سکریٹری آف اسٹیٹ انگلستان میں سب سے اگلی کرسی پر اور سب سے اہم میز پر اور جائے واردات یعنی یہاں ہندستان میں وائسرائے۔ موخر الذکر کے بے پناہ حقوق تھے۔ اگرچہ آخری ذمے داری وہائٹ ہال ہی پر تھی۔

افادیت پسندی (Utilitarianism) کے خیال کے زیر اثر مالی انتظامی اور عدلیہ کی تبدیلیاں ہونا شروع ہوئیں۔ آئینی اخلاقیات میں افادیت پسندی کی روایت، انگلستان میں اٹھارھویں صدی سے چلی ہوئی وہ روایت ہے جس میں ہر وہ عمل اچھا سمجھا جاتا ہے جو مسرت اور خوشی کو فروغ دینے میں معاون ہو، اور یہ مسرت نہ صرف عمل کرنے والے کے لیے ہو بلکہ ہر اس شخص کے لیے ہو جو اس عمل سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی کے مطابق، بنتھم اور مل جیسے سیاسی فلسفیوں نے ایکٹ کی ازلی ماہیت یا اس کے بنانے والے کی نیت کے مقابلے میں اس کے عواقب پر توجہ مرکوز کی۔

میکالے کی تجویز کے مطابق، ایک متوسط طبقہ، ایسے لوگوں کا ایک طبقہ جو رنگ و خون میں ہندستانی اور مذاق، آرا، اخلاق اور ذہن میں انگریز ہو، پیدا کرنے کے لیے جو حکمرانوں اور ان کی لاکھوں کی تعداد میں رعایا کے مابین ترجمان کی حیثیت سے کام کرے گا، انگریزی تعلیم کو ترجیحی درجہ دیا گیا۔

''حقیقی سرکاری رویہ'' بقول کپلنگ تھا، سفید چمڑی والوں کا بوجھ اٹھانا'' عزیز نے اظہار خیال کیا۔ اس کا لہجہ اور آواز ایسی تھی جس میں کوئی شخص کسی ایسی چیز کے بارے میں بات کرتا ہے جو اتنی ناقابل یافت ہو کہ اس کے بارے میں سوچنے کی بھی ضرورت نہ ہو۔

1857 کی شورش کے اور بھی بہت سے دوررس عواقب تھے۔ ایک تو یہی کہ انتظامیہ جیسے جیسے اداریاتی اور رسمی ہوتا گیا، زیادہ محتاط نگہبان حضرات انگلیسیت کے رہنماؤں پر فوقیت حاصل کرنے لگے۔ متعدد ایڈمنسٹریٹر تھے جنھوں نے شورش کے لیے عیسائی مشنریوں کو ذمے دار ٹھہرایا اور ان کے مسیحی جوش و خروش کو دباکر مذہبی غیر جانب داری کی تلقین کی۔ مشنری کام پھر شروع ہوا مگر 1857 کے رن و دار کے طویل سایوں میں۔ الگزینڈر ڈف (1820) جیسے اسکاٹ مبلغین کو تحریک دینے والے ایک مسیحی ہندستان کی تعمیر کے خواب کا سحر آہستہ آہستہ دھندلا پڑا۔ مگر پنجاب میں ایک طرف مشن اور دوسری طرف آریہ سماجی اور احمدی لوگوں کے درمیان تلخ و طویل مناظرے ختم نہ ہوئے۔ بہرحال جب مشنریوں کی طرف سے خطرات کم ہوئے تو آریہ سماجیوں نے مسلم مناظرین سے حساب بے باق کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔

(جاری)

(مترجم: مسعود الحق)

□□□

139, Uttarakhand, JNU,
New Delhi-110 067

سلمان عابد

کیریئر گائیڈنس

سرکاری قومی روزگار کے امتحانات

ملازمت اور روزگار سے متعلق نوجوانوں میں اکثر یہ تاثر عام ہے کہ آج روزگار نہیں ملتا اور اس کے حصول میں ہزار دشواریاں حائل ہیں۔ مگر سچائی تو یہ ہے کہ قابل با صلاحیت اور روزگار کے معیار و تقاضوں پر پورا اترنے والوں کے لیے روزگار کی کمی نہیں ہے۔

حصولِ روزگار کے لیے مرکزی اور ریاستی حکومتیں اپنے طور پر مختلف امتحانات منعقد کرتی ہیں جن کا وقتاً فوقتاً مقامی و قومی اخبارات میں اعلان شائع ہوتا ہے۔ قومی سطح کی ملازمتوں اور روزگار کے لیے مرکزی حکومت کے تحت ایک ادارہ قائم ہے جسے یونین پبلک سروس کمیشن کہا جاتا ہے۔ ہر سال ملک کی مختلف کلیدی خدمات کے لیے باصلاحیت نوجوانوں کے انتخاب کے لیے امتحانات منعقد کرنے کی ذمے داری اسی کمیشن کی ہے۔ یہ امتحانات بے حد اہم اور مسابقتی ہیں۔ ملک کے تمام گوشوں سے لاکھوں امیدواران میں شریک ہوتے ہیں۔ ان امتحانات میں کامیاب ہونے کے لیے منصوبہ بند تیاری لازمی ہے۔ صحیح سمت میں، صحیح ڈھنگ سے بروقت کوشش ہی کیریئر کی اونچائیوں تک لے جانے والی ہوتی ہے۔ اس لیے ہم یہاں اگلے سال 2004 میں منعقد ہونے والے ان امتحانوں کی مکمل تفصیل پیش کر رہے ہیں تاکہ امیدواران امتحانات کی مناسب اور منصوبہ بند تیاری کر سکیں۔

I- کمبائنڈ ڈیفنس سروسیز امتحان:

نوٹیفکیشن کی اشاعت کی تاریخ : 13-09-2003

فارم جمع کرنے کی آخری تاریخ : 13-10-2003

امتحان کا انعقاد : 15-02-2004

اہلیت: IMA/OTA کے لیے گریجویٹس اہل ہیں۔ نیول اکیڈمی (Navel Academy) کے لیے فزکس اور ریاضی کے ساتھ بی۔ایس۔سی۔ یا انجینئرنگ گریجویٹ اہل ہیں۔ جبکہ ایئرفورس میں داخلے کے لیے ریاضی، فزکس اور کیمسٹری کے ساتھ 2+10 کے بعد کسی بھی سبجیکٹ میں گریجویٹ اہل ہیں یا پھر انجینئرنگ میں بیچلر ڈگری کامیاب ہوں۔ یکم جنوری 2005 تک عمر 19 سے 25 سال کے درمیان ہو۔ جو طلبہ اپنے سال آخر کے امتحان میں شریک ہو رہے ہوں، وہ بھی درخواست داخل کر سکتے ہیں۔

II- نیشنل ڈیفنس اکیڈمی اور نیول اکیڈمی امتحان:

نوٹیفکیشن کی اشاعت کی تاریخ : 18-10-2003

فارم جمع کرنے کی آخری تاریخ : 17-11-2003

امتحان کا انعقاد : 04-04-2004

اہلیت: 2+10 میں کامیاب طلبہ نیشنل ڈیفنس اکیڈمی (NDA) کی آرمی ونگ کے لیے اور MPC (ریاضی، فزکس اور کیمسٹری) سے 2+10 کامیاب طلبہ ایئرفورس اور نیول ونگ کے لیے درخواست داخل کر سکتے ہیں۔ یکم جنوری 2005 تک امیدوار کی عمر ساڑھے سولہ سال سے 19 سال کے درمیان ہو۔ مشروط طور پر اپنے فائنل امتحان لکھ رہے طلبہ بھی درخواست داخل کر سکتے ہیں۔

III- سول سروسیز پریلمنری امتحان:

نوٹیفکیشن کی اشاعت کی تاریخ : 22-11-2003

فارم جمع کرنے کی آخری تاریخ : 22-12-2003

امتحان کا انعقاد : 16-05-2004

اہلیت: کسی بھی یونی ورسٹی سے ڈگری کامیاب، یکم اگست 2004 تک 21 سے 30 سال عمر ہو۔ مشروط طور پر ایسے امیدوار بھی درخواست داخل کر سکتے ہیں جو گریجویشن کے سال آخر کا امتحان لکھ رہے ہوں۔

IV- انجینئرنگ سروسیز امتحان:

نوٹیفکیشن کی اشاعت کی تاریخ : 03-01-2004

فارم جمع کرنے کی آخری تاریخ : 03-02-2004

امتحان کا انعقاد : 12-06-2004 (تین دن)

اہلیت: انجینئرنگ میں ڈگری یا ایم۔ایس۔سی۔ کامیاب، یکم اگست 2004 تک 21 سے 30 سال عمر کے حامل طلبہ درخواست داخل کر سکتے ہیں۔ اپنے کورس میں سال آخر کے امتحان میں شرکت کرنے والے طلبہ بھی درخواست داخل کر سکتے ہیں۔

V- انڈین فاریسٹ سروسیز امتحان:

نوٹیفکیشن کی اشاعت کی تاریخ : 07-02-2004

فارم جمع کرنے کی آخری تاریخ : 08-03-2004

امتحان کا انعقاد : 10-07-2004

(دس دنوں کے لیے)

اہلیت: سائنسی مضامین کے ساتھ بیچلر ڈگری، انجینئرنگ یا ایگریکلچر یا فاریسٹری میں بیچلر ڈگری یا فائنل امتحان میں شرکت کرنے والے ایسے طلبہ

درخواست داخل کر سکتے ہیں جن کی عمر یکم جولائی 2004 تک 21 سے 30 سال کے درمیان ہو۔

VI- اسپیشل کلاس ریلوے اپرنٹس امتحان:

نوٹیفکیشن کی اشاعت کی تاریخ :	14-02-2004
فارم جمع کرنے کی آخری تاریخ :	15-03-2004
امتحان کا انعقاد :	25-07-2004

اہلیت: MPC سے 2+10 کامیاب ایسے طلبہ جن کی عمر یکم اگست 2004 کو 17 سے 21 سال کے درمیان ہو، درخواست گزاری کے اہل ہیں۔ جو طلبہ سال آخر یا ڈگری کے سال اوّل کا امتحان لکھ رہے ہوں، وہ بھی بعض شرائط کے ساتھ امتحان میں شرکت کر سکتے ہیں۔

VII- کمبائنڈ ڈیفنس سروسیز امتحان (II)-2004:

نوٹیفکیشن کی اشاعت کی تاریخ :	20-03-2004
فارم جمع کرنے کی آخری تاریخ :	19-04-2004
امتحان کا انعقاد :	22-08-2004

اہلیت: وہی جو سلسلہ نمبر 1 میں مذکور ہے۔ البتہ عمر کا حساب یکم جولائی 2005 تک کیا جائے گا۔

VIII- نیشنل ڈیفنس اکیڈمی اور نیول اکیڈمی امتحان-II:

نوٹیفکیشن کی اشاعت کی تاریخ :	24-04-2004
فارم جمع کرنے کی آخری تاریخ :	24-05-2004
امتحان کا انعقاد :	19-09-2004
	(ایک دن کے لیے)

اہلیت: وہی جو سلسلہ نمبر 2 میں مذکور ہے۔ البتہ عمر کا حساب یکم جولائی 2005 تک کیا جائے گا۔

IX- سنٹرل پولیس فورس (اسسٹنٹ کمانڈنٹس امتحان):

نوٹیفکیشن کی اشاعت کی تاریخ :	08-05-2004
فارم جمع کرنے کی آخری تاریخ :	07-06-2004
امتحان کا انعقاد :	03-10-2004

اہلیت: کسی بھی سبجیکٹ میں ڈگری کامیاب یکم اگست 2004 تک 20 سے 25 سال عمر کے طلبہ درخواست داخل کر سکتے ہیں۔ سال آخر کا امتحان لکھ رہے طلبہ بھی شریک امتحان ہو سکتے ہیں۔

X- سول سروسیز مین (Mains) امتحان:

امتحان کا انعقاد :	15-10-2004
	(21 دنوں کے لیے)

اہلیت: وہی جو سلسلہ نمبر 4 میں مذکور ہے۔

XI- انڈین اکنامک/انڈین اسٹاٹسٹیکل سروسیز امتحان:

نوٹیفکیشن کی اشاعت کی تاریخ :	12-06-2004
فارم جمع کرنے کی آخری تاریخ :	12-07-2004
امتحان کا انعقاد :	20-11-2004 سے
	(تین دن کے لیے)

اہلیت: اکنامکس/ اسٹاٹسٹکس میں پوسٹ گریجویشن ڈگری کامیاب یکم جنوری 2004 تک 21 سے 30 سال عمر کے حامل اور فائنل امتحان لکھ رہے طلبہ شریک ہو سکتے ہیں۔

XII- جیالوجسٹ امتحان:

نوٹیفکیشن کی اشاعت کی تاریخ :	19-06-2004
فارم جمع کرنے کی آخری تاریخ :	19-07-2004
امتحان کا انعقاد :	27-11-2004
	(تین دن کے لیے)

اہلیت: جیولوجی، اپلائیڈ جیولوجی میں ماسٹر ڈگری کامیاب یکم جنوری 2004 تک 21 سے 32 سال کے درمیان عمر کے حامل طلبہ درخواست داخل کر سکتے ہیں۔ سال آخر کے طلبہ بھی اہل ہیں۔

XIII- سیکشن آفیسر/ اسٹینوگرافر گریڈ B /گریڈ-I) محدود، ڈپارٹمنٹل امتحان-2004:

نوٹیفکیشن کی اشاعت کی تاریخ :	26-06-2004
فارم جمع کرنے کی آخری تاریخ :	23-08-2004
امتحان کا انعقاد :	26-12-2004
	(چار دن کے لیے)

اہلیت اور عمر کی صراحت اعلانیہ میں کی جا سکے گی۔ کیوں کہ یہ محکمہ جاتی امتحان صرف بعض محدود زمروں کے سرکاری عہدیداروں اور ملازمین کے لیے مختص ہے۔

مذکورہ امتحانات کی تواریخوں میں بعض بہت ہی ناگزیر وجوہات کی بنا پر کبھی کبھی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ تمام زمروں کے امتحانات کے لیے لڑکیاں بھی اہل ہیں مگر صرف CDS کے NDA اور NA امتحانوں کے لیے (نمبر III اور VIII) اہل نہیں۔

□□□

161, Career Manzil, Nehru Nagar, kachi Goda,
Hyderabad-27

نعیم احسن

چوتھی قسط

اِنٹرنیٹ گائیڈ

ای میل: ای میل کو آپ انٹرنیٹ کا روحِ رواں کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ آج اسی کے ذریعے روزانہ لاکھوں کی تعداد میں پیغامات برقی تاروں کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچائے جا رہے ہیں اور اسے استعمال کرتے ہوئے دنیا بھر میں لوگ چند سیکنڈوں میں ایک دوسرے سے کمیونی کیٹ کر رہے ہیں۔

بین الاقوامی کمپیوٹر نیٹ ورک کے طور پر انٹرنیٹ کے وسیع استعمال کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ سسٹم بہت لچک دار ہے۔ اس میں ہر قسم کا نیٹ ورک اور کمپیوٹر شامل ہوسکتا ہے اور اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ آپ خواہ کسی بھی قسم کا کمپیوٹر استعمال کر رہے ہوں، موڈم کے ذریعے یا نیٹ ورک کے ذریعے منسلک ہوں، ای میل کے لیے کوئی بھی پروگرام استعمال کر رہے ہوں۔ آپ اپنا ای میل پورے انٹرنیٹ پر بھیج اور وصول کر سکتے ہیں۔ لیکن منفی پہلو یہ ہے کہ اتنے ای میل پروگرام دستیاب ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ لہٰذا ہم یہاں ای میل سے وابستہ صرف عمومی اعمال کی بات کریں گے۔ یعنی وہ چیزیں آپ کے سامنے لائی جائیں گی جن کے جاننے کی آپ کو ضرورت ہوگی خواہ آپ کوئی بھی ای میل پروگرام استعمال کر رہے ہوں۔ اسی طرح اصطلاحات کے سلسلے میں بھی یہی طرزِ عمل ہے کہ ان باکس اور آؤٹ باکس کی طرح کی عمومی اصطلاحات استعمال کریں گے۔

ای میل کے ساتھ کام کرنا: درج ذیل اقدامات ہیں جو عام طور پر ای میل کے سلسلے میں آپ کو کرنا ہوتے ہیں۔

(1) میل پروگرام چلانا، (2) میل بھیجنا، (3) آنے والی میل پڑھنا، (4) میل کا جواب دینا، (5) میل ڈیلیٹ کرنا اور میل پروگرام سے باہر نکلنا۔

1- میل پروگرام چلانا: زیادہ تر ای میل پروگرام آپ اسی طرح شروع کر سکتے ہیں جس طرح ونڈوز انوائرمنٹ میں چلنے والا کوئی بھی پروگرام استعمال کیا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ عمل پروگرام آئیکون (Icon) پر ڈبل کلک کر کے یا مینو سے پروگرام کا انتخاب کر کے کیا جا سکتا ہے۔ جیسے ونڈوز 95- میں اسٹارٹ مینو (Start Menu) اور میک (MAC) کی صورت ایپل مینو (Apple Menu) پر سے آغاز کیا جا سکتا ہے۔ پروگرام شروع ہونے پر آپ کو اپنے ان میل باکس کے مندرجات نظر آئیں گے یا پھر میل باکسز کی لسٹ ظاہر ہوگی۔ ایسی صورت میں آپ Inbox کو کھولنا چاہیں گے۔ جس میں تازہ ترین آنے والے پیغامات ظاہر ہوں گے۔ آپ کو خود بخود ایک آؤٹ میل باکس بھی دستیاب ہوگا جہاں آپ اپنے بھیجے جانے والے پیغامات محفوظ کر سکتے ہیں۔ کئی پروگرام اسے خود بخود بنا دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ عام طور پر ڈیلیٹ کیے گئے پیغامات یا ٹریس میل باکس دستیاب ہوتا ہے جہاں پر متنازعہ پیغامات اس وقت تک رہتے ہیں جب تک انھیں مکمل طور پر ختم نہ کر دیا جائے۔

میل باکس عام طور پر بھیجنے والے کا نام، پیغام کا عنوان اور تاریخ وغیرہ ظاہر کرتے ہیں۔ جب آپ کسی بھی میل باکس میں کسی بھی پیغام پر ڈبل کلک کریں گے تو پیغام اپنی ہی ونڈو میں کھل جائے گا۔

2- میل بھیجنا: تمام میل پروگراموں میں New Message یا کمپوز ای میل کمانڈ موجود ہوتا ہے۔ عام طور پر آپ اسے Message مینو میں دیکھ سکتے ہیں اور اس کمانڈ کے لیے عام طور پر کی بورڈ شارٹ کٹ بھی موجود ہوتا ہے جیسے نئے پیغام کے لیے Ctrl+N۔ جب آپ نیا پیغام شروع کرتے ہیں تو آپ کا پروگرام آپ کے لیے ایک نئی ونڈو کھولتا ہے۔ اس ونڈو میں To کے خانے میں اس فرد کا ایڈریس ٹائپ کریں جسے آپ میل بھیجنا چاہتے ہیں۔ ایڈریس اسی صورت میں ٹائپ کریں جس طرح یہ وضع کیا گیا ہے جیسے urducoun@ndf.vsnl.net.in ''اردو دنیا'' کا ایڈریس ہے۔ اس ایڈریس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ یہ کئی حصوں پر مشتمل ہوتا ہے اس میں ہر حصہ کسی نہ کسی مخصوص چیز کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کی مجموعی ترکیب اس طرح سے ہوتی ہے کہ دنیا بھر میں اس جیسا ایڈریس اور کوئی نہیں ہوتا ہے۔ جب آپ کسی آئی ایس پی (ISP) سے کنکشن لیتے ہیں تو ای میل ایڈریس بھی آپ کو وہی فراہم کرتے ہیں۔ اب اس ایڈریس کا بغور جائزہ لیں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ اس میں "urducoun" سے مراد یوزر نیم ہے۔ یہ ہر استعمال کنندہ کے لیے انفرادی ہوتا ہے۔ @ کا نشان ای میل کی مخصوص علامت ہے، جس لائن میں بھی آپ کو یہ نظر آئے گا وہ کوئی ای میل ایڈریس ہوگا۔ "ndf.vsnl" وہ فرم ہے جو سروس فراہم کر رہی ہے۔ یہ علاقائی (Domain) نام ہے اور اس نام سے دنیا بھر میں اور کوئی فرم نہیں ہوگی۔ یہ نام باقی دنیا میں آپ کے لیے کوڈ کا کام دیتا ہے۔ اس کے آگے ڈاٹ (.) اور پھر تین حرفی کوڈ ہوتا ہے۔ یہ کوڈ بہت سی شکلوں میں استعمال ہوتے ہیں جو مختلف چیزوں کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں۔ جیسے کاروبار کے لیے (.com) کسی تنظیم وغیرہ کے لیے (.org) تعلیم سے متعلق اداروں وغیرہ کے لیے (.edu) اور مختلف حکومتی شعبوں کے لیے (.gov)۔ چند میل پروگراموں میں انٹرنیٹ ای میل ایڈریس کے شروع یا آخر میں کچھ اضافی ٹیکسٹ بھی لگایا جاتا ہے۔ تاہم اوپر دیا گیا فارمیٹ ہی عام طور سے استعمال ہوتا ہے۔

تقریباً ہر ای میل پروگرام میں آپ ایک باکس سے دوسرے باکس پر یا ایک حصہ میں اندراج کرنے کے بعد دوسرے حصہ میں جا کر اندراج کرنے کے لیے ٹیب بٹن استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ جس باکس یا Areal میں جانا ہو وہاں پر Arrow لے جا کر محض کلک کر کے بھی اندراج کر سکتے ہیں۔

To کے خانے میں ایڈریس ٹائپ کرنے کے بعد Tab کے ذریعے Subject کے خانے میں عنوان ٹائپ کریں۔ یہ بات یاد رکھیں کہ مکتوب الیہ سب سے پہلے جس چیز کو دیکھے گا وہ عنوان ہی ہوگا اس لیے عنوان درج کرتے

وقت جامعیت اور اختصار سے کام لیں۔ کسی اور مکتوب الیہ کو بھی ای میل پیغام کی ایک کاپی بھیجنی ہو تو ٹیب کے ذریعے :Cc کے خانے میں جا کر اس کا ایڈریس ٹائپ کریں۔ اس کے بعد ٹیب بٹن (ہوسکتا ہے آپ کو ایک سے زائد مرتبہ پریس کرنا پڑے) کے ذریعے کرسر (Cursor) کو پیغام کے خانے (Message Area) میں لائیں۔ یہاں پر آپ نفس مضمون ٹائپ کریں گے اور ان معلومات کا اندراج کریں گے جو مکتوب الیہ تک پہنچانا مقصود ہیں۔ نیز یہاں پر ٹائپ کرنے کے علاوہ پہلے سے موجود ٹیکسٹ فائل کو بھی پیسٹ کیا جا سکتا ہے اور کسی ورڈ پروسیسرز میں بھی ای میل کے لیے ٹائپنگ کا عمل کیا جا سکتا ہے۔

زیادہ تر میل پروگراموں کے اندر دائیں کنارے تک جا کر خود بخود نئی سطر بائیں طرف سے شروع کرنے کی اہلیت ہے۔ لہٰذا آپ بے دھڑک ٹائپ کریں، صرف اس جگہ انٹر دینے کی ضرورت ہوگی جہاں سے نیا پیراگراف شروع کرنا ہوگا۔

پیغام تیار ہونے کے بعد اسے بھیج دیں یا پھر بہت سے جانے والے پیغامات کی قطار میں شامل کر دیں۔

3- ای میل پڑھنا: جب بھی آپ نیٹ کے ساتھ رابطہ کریں سب سے پہلے میل چیک کریں یہ اسی طرح ہے جس طرح آپ اپنے پوسٹ آفس کا میل باکس چیک کرتے ہیں۔ کئی میل پروگرام بھیجے جانے والے پیغامات کی قطار میں ہی آنے والے پیغام کو شامل کر دیتے ہیں، کئی ایسے ہیں کہ اسٹارٹ ہونے پر سب سے پہلے نیا میل کو دکھاتے ہیں۔ نیا آنے والا یا تا حال پڑھے نہ جانے والے میل کسی نہ کسی طور ظاہر ہو جاتے ہیں کہ یہ نیا میل ہے اس کی کئی علامتیں ہیں جیسے عنوان والی لائن بولڈ صورت میں ظاہر ہوتی ہے یا پھر نئے پیغامات کے ساتھ کوئی بلٹ یا چیک مارک وغیرہ لگا ہوتا ہے۔

میل کے مندرجات کو اسکرین پر ظاہر کرنے کے لیے ونڈو میں سے اسے ہائی لائٹ کریں اور انٹر پریس کر دیں یا پھر فقط اس پر ڈبل کلک کر دیں۔ میل اپنے ونڈو میں ظاہر ہوگا بالکل اسی طرح جس طرح کا پیغام آپ باہر بھیجتے ہیں۔ اگر مضمون زیادہ طویل ہو اور ایک ہی دفعہ اسکرین پر نظر نہ آ رہا ہو تو دائیں طرف موجود اسکرول بار (Scrall bar) کے ذریعے مضمون کو اسکرین پر اوپر یا نیچے کی سمت اسکرول کیا جا سکتا ہے۔ پیغام پڑھنے کے بعد آپ اسے کلوز بھی کر سکتے ہیں اور اس پیغام کا Reply کے ذریعے جواب بھی دے سکتے ہیں۔

4- میل کا جواب دینا: New Message کمانڈ کے ساتھ ہی کہیں، عام طور پر اسی مینو یا بٹن بار میں' آپ کو Reply کمانڈ دکھائی دے گا۔ میل کا جواب دینے کے لیے پیغام کو ان باکس Inbox میں ہائی لائٹ کریں یا پھر اسے کھول لیں اور ریپلائی کمانڈ کا انتخاب کریں۔ آپ کا پروگرام خود بخود نئے پیغام کے لیے تیار ہو جائے گا اور جسے آپ جواب دینا چاہتے ہیں اس کا ایڈریس بھی درج ہو جائے گا۔ کئی میل پروگرام اس اصل پیغام کو بھی مندرجات میں شامل کر دیتے ہیں جس کا جواب آپ دے رہے ہوتے ہیں لیکن اس میں آپ کے پاس آپشن Option ہوتا ہے یعنی پروگرام آپ کو موقع فراہم کرتا ہے کہ آپ اوریجنل ٹیکسٹ بھی شامل کرنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ اکثر اور خاص طور پر ایسے ای میل پروگراموں میں جو بنیادی طور پر انٹرنیٹ کے لیے استعمال ہوتے ہیں ان میں ظاہر ہونے والا اصل پیغام ہر لائن سے > کے علامت کے ساتھ شروع ہوتا ہے یہ اس بات کی علامت ہے کہ بعد آنے والا ٹیکسٹ حوالہ کے طور پر ہے۔ کئی پروگرام ایسے حوالوں کو اور طرح بھی ظاہر کرتے ہیں مثال کے طور پر حوالہ کا ٹیکسٹ حاشیہ چھوڑ کر یعنی انڈنٹ کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔

بعض اوقات آپ پیغام ہر اس فرد کو بھیجنا چاہتے ہیں جس جس کو اصل پیغام ملا ہے۔ مثال کے طور پر جس میل کا آپ جواب لکھنا چاہ رہے ہیں وہ آپ کے ساتھ ساتھ دس اور آدمیوں کو بھی بھیجی گئی ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا جواب بھی ان تمام لوگوں تک پہنچے، اس کے لیے اکثر ای میل پروگراموں میں نارمل ایپلائی کمانڈ میں بڑے متنوع آپشن Option دستیاب ہوتے ہیں جو تمام مکتوب الیہ کو جواب کے لیے شامل کر لیتے ہیں۔

عنوان ٹائپ کریں اور ٹیب پریس کریں۔ اگر زیادہ مکتوب الیہ ہوں تو اس کا اندراج کریں اور پھر ٹیب کے ذریعے اس حصہ میں آ جائیں۔ جہاں آپ کو پیغام کا جواب ٹائپ کرنا ہے۔ ٹائپ کرنے کے بعد Send یا Queue کمانڈ کی ضرورت کے مطابق انتخاب کرلیں۔

5- میل ڈیلیٹ کرنا اور میل پروگرام سے باہر نکلنا: اگر آپ ہر آنے والے میل کو رکھتے رہیں گے تو ایک وقت میں آپ کے پاس اتنے زیادہ میل ہو جائیں گے کہ آپ ان میلوں کی وجہ سے پریشانی میں پڑ جائیں گے۔ ایسی صورت میں نہ صرف آپ کا ان باکس (Inbox) گورکھ دھندا بن جائے گا بلکہ بلاوجہ ہارڈ ڈسک اسپیس بھی استعمال ہوگا۔ اس لیے عادت بنائیں کہ جن پیغامات کو پڑھ چکے ہوں اور جواب دے چکے ہوں انھیں وقتاً فوقتاً ڈیلیٹ کرتے رہیں۔ پیغام ڈیلیٹ کرنے کا وہی سادہ طریقہ ہے یعنی ہائی لائٹ کریں اور ڈیلیٹ کر دیں یا پھر ڈیلیٹ یا ٹریش بٹن پر کلک کر دیں۔ کئی پروگراموں میں اس عمل سے پیغام Deleted-Mail یا ٹریش میل باکس میں چلے جاتے ہیں اور اس وقت تک رہتے ہیں جب تک آپ ٹریش کو خالی نہ کر دیں یا پروگرام سے نکل نہ جائیں۔

اگر ایسی صورت میں کسی میل کی ضرورت پڑے تو آپ ٹریش میل باکس سے واپس لا سکتے ہیں۔ اس کے لیے ٹریش میل باکس یا Deleted میل باکس کو کھولیں اور پروگرام کے مطابق ایسی کمانڈ دیکھیں جو پیغام کو ایک باکس سے دوسرے باکس میں ''ٹرانسفر'' کر سکے یہ کمانڈ عام طور پر ''ٹرانسفر'' ہی کہلاتی ہے۔ جب یہ کمانڈ مل جائے تو اس کے ذریعے پیغام کو واپس ان باکس (Inbox) میں لے جائیں۔

کسی بھی میل پروگرام سے باہر نکلنے کا طریقہ وہی ہے جو دوسری ونڈوز ایپلی کیشنز کا ہے جب آپ میلنگ کے متعلق تمام امور سر انجام دے چکیں اور پروگرام سے باہر نکلنا چاہیں تو تقریباً ہر پروگرام کے مینو میں آپ کو Exit یا Quit کمانڈ دستیاب ہوگا۔ اس کے ذریعے آپ پروگرام سے باہر جا سکتے ہیں۔ (جاری)

(تلخیص وترتیب: محمد سمیم الدین ندوی)

اردو ادب

(1) ''سات کھیل'' کا تعلق کس صنف سے ہے؟

(الف) ڈرامہ (ب) افسانہ

(ج) ناول (د) انشائیہ

(2) مندرجۂ ذیل میں سے بیدی کے ڈراموں کا مجموعہ کون سا ہے؟

(الف) گرہن (ب) دانہ و دام

(ج) اپنے دکھ مجھے دے دو (د) سات کھیل

(3) 'تین عورتیں' کس کے ڈراموں کا مجموعہ ہے؟

(الف) اوپندر ناتھ اشک (ب) محمد مجیب

(ج) منٹو (د) بیدی

(4) ''دروازے کھول دو'' کس کے ڈراموں کا مجموعہ ہے؟

(الف) کرشن چندر (ب) منٹو

(ج) خواجہ احمد عباس (د) عشرت رحمانی

(5) مندرجۂ ذیل میں سے عصمت چغتائی کے ڈراموں کا مجموعہ کون ہے؟

(الف) شیطان (ب) دروازے

(ج) آؤ (د) اسیرِ حرص

(6) ''اردو ڈرامے کا ارتقا'' کس کی کتاب ہے؟

(الف) اخلاق اثر (ب) محمد حسن

(ج) مسعود حسن رضوی ادیب (د) عشرت رحمانی

(7) اردو کا سب سے بڑا ڈرامہ نگار اور اردو ڈرامے کا شیکسپیئر کسے تسلیم کیا جاتا ہے؟

(الف) امانت لکھنوی (ب) آغا حشر کاشمیری

(ج) امتیاز علی تاج (د) محمد مجیب

(8) مندرجۂ ذیل میں سے اوپندر ناتھ اشک کے ڈراموں کا مجموعہ کون سا ہے؟

(الف) پاپی (ب) چرواہے

(ج) قیدِ حیات (د) مندرجہ بالا تینوں

(9) محمد حسن نے ایمرجنسی پر کون سا مشہور ڈرامہ تخلیق کیا؟

(الف) خانہ جنگی (ب) ضحاک

(ج) رابعہ (د) کالے کوے نے کہا

(10) ''پردۂ غفلت'' کس کا ڈرامہ ہے؟

(الف) محمد حسن (ب) مرزا ادیب

(ج) عابد حسین (د) امتیاز علی تاج

(11) مندرجۂ ذیل میں سے امتیاز علی تاج کا ڈرامہ کون ہے؟

(الف) انار کلی (ب) مغلِ اعظم

(ج) ضحاک (د) دروازے

(12) 'خانہ جنگی' کس کا ڈرامہ ہے؟

(الف) محمد مجیب (ب) محمد حسن

(ج) عابد حسین (د) خواجہ احمد عباس

(13) 'مکالمہ' کے بغیر کس صنف کا تصور محال ہے؟

(الف) ناول (ب) افسانہ

(ج) ڈرامہ (د) ان میں سے کوئی نہیں

(14) '' مجھے بلا تقیہ کہنا پڑتا ہے کہ ہندستان کے اسٹیج پر ڈراما کا اسٹائل بدلنے کا فخر میرے ناچیز قلم کو حاصل ہے اور یہ انقلاب عظیم' خون ناحق'' نے پیدا کیا۔ ناٹک کے زمین و آسمان بدلنے کا زمانہ 1889 ہے۔ اس کے بعد تقلید و تاشی کا کام شروع ہوا۔'' یہ دعویٰ کس ڈرامہ نگار کا ہے؟

(الف) آغا حشر کاشمیری (ب) احسن لکھنوی

(ج) بیتاب دہلوی (د) امتیاز علی تاج

(15) آرام نے شیکسپیئر کے ڈرامے Merchant of venice کا اردو ترجمہ کس نام سے کیا؟

(الف) وینس کا سوداگر (ب) جواں بخت

(ج) انٹونیو (د) ان میں سے کوئی نہیں

(16) ''خونِ ناحق'' (احسن لکھنوی) شیکسپیئر کے کس ڈرامے کا ترجمہ ہے؟

(الف) Macbeth

(ب) As you like it

(ج) A midsummer nights dream

(د) Hamlet

(17) 'انار کلی' کا سنِ تصنیف کیا ہے؟

(الف) 1922 (ب) 1924

(ج) 1928 (د) 1932

(18) ''انار کلی'' کس کا المیہ ہے؟

(الف) اکبر (ب) سلیم
(ج) انارکلی (د) مذکورہ بالا تینوں کا

(19) ڈرامہ "کربلا" کس کی تخلیق ہے؟
(الف) عبدالماجد دریابادی (ب) ظفر علی خاں
(ج) پریم چند (د) شوق قدوائی

(20) "سیب کا درخت" کس کا ڈرامہ ہے؟
(الف) پطرس بخاری (ب) عزیز احمد
(ج) جعفر علی خاں اثر (د) نورالحسن ہاشمی

(21) مندرجۂ ذیل میں سے کون سا محمد مجیب کا ڈرامہ نہیں ہے؟
(الف) آزمائش (ب) انجام
(ج) ہیروئن کی تلاش (د) غالب کی واپسی

(22) "اردو ڈرامہ کی تاریخ" کس کی کتاب ہے؟
(الف) بادشاہ حسین (ب) عشرت رحمانی
(ج) اخلاق اثر (د) ان میں سے کسی کی نہیں

(23) محمد عمر اور نورالٰہی صاحبان نے ڈرامے پر کون سی کتاب لکھی؟
(الف) ڈرامہ نگاری کا فن (ب) اردو ڈرامہ، روایت اور فن
(ج) ناٹک ساگر (د) ان میں سے کوئی نہیں

(24) "ڈرامہ" یونانی زبان کے کس لفظ سے مشتق ہے؟
(الف) ڈراؤ (ب) ڈرام
(ج) ڈرائی (د) ان میں سے کوئی نہیں

(25) 'آگرہ بازار' کس کا ڈرامہ ہے؟
(الف) محمد مجیب (ب) حبیب تنویر
(ج) رفعت سروش (د) محمد حسن

(26) "قولِ محال" کس کے انشائیوں میں کثرت سے پایا جاتا ہے؟
(الف) رشید احمد صدیقی (ب) علی اکبر قاصد
(ج) احمد جمال پاشا (د) ان میں سے کوئی نہیں

(27) خالص مزاح کس انشائیہ نگار کی تخلیقات کا اہم وصف ہے؟
(الف) رشید احمد صدیقی (ب) سید محمد حسنین
(ج) پطرس بخاری (د) ان میں سے کوئی نہیں

(28) مندرجۂ ذیل میں سے پطرس کا انشائیہ کون سا ہے؟
(الف) ریڈیو سننے والے (ب) شرافت
(ج) کُتّے (د) الیکشن

(29) مندرجۂ ذیل میں سے رشید احمد صدیقی کا انشائیہ کون سا ہے؟
(الف) احمق کی جنت (ب) شراب کی ممانعت
(ج) دیہاتی ڈاکٹر (د) مندرجہ بالا بھی

(30) رشید احمد صدیقی نے اپنے انشائیہ میں 'ارہر کا کھیت' کو کس سے تشبیہ دیا ہے؟
(الف) گرین پارک (ب) ہائیڈ پارک
(ج) پارلیامنٹ (د) ان میں سے کوئی نہیں

(31) "بے پرکی" کس کا مزاحیہ ناول ہے؟
(الف) مجتبیٰ حسین (ب) احمق پھپھوندوی
(ج) آوارہ (د) ان میں سے کوئی نہیں

(32) مندرجۂ ذیل میں سے کون یوسف ناظم کے انشائیوں کا مجموعہ نہیں ہے؟
(الف) بالکلیات (ب) خنداں
(ج) فی الحال (د) فی الفور

(33) یوسف ناظم کے خاکوں کا مجموعہ کس نام سے شائع ہوا؟
(الف) ذکر خیر (ب) اب جن کے دیکھنے کو......
(ج) یہ پری چہرہ لوگ... (د) ان میں سے کوئی نہیں

(34) "رانگ نمبر" اور "گول مال" کس کے انشائیوں کے مجموعے ہیں؟
(الف) علی اکبر قاصد (ب) احمد جمال پاشا
(ج) شفیقہ فرحت (د) ان میں سے کوئی نہیں

(35) مندرجۂ ذیل میں سے کون سا مضمون فرحت اللہ بیگ کا نہیں ہے؟
(الف) نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی
(ب) انشا
(ج) وحید الدین سلیم
(د) غالب

(36) مندرجۂ ذیل میں سے کون سا انشائیہ وجاہت علی سندیلوی کا نہیں ہے؟
(الف) برکت ایک چھینک کی (ب) حقوقِ ہمسایہ
(ج) عشق پر زور نہیں (د) فسادی چچا

(37) "شوہر بی بی" کس کی مزاحیہ تحریر ہے؟
(الف) عظیم بیگ چغتائی (ب) مشتاق احمد یوسفی
(ج) وجاہت علی سندیلوی (د) یوسف پاپا

(38) شوکت تھانوی کا نام کیا ہے؟
(الف) محمد عمر (ب) احمد جمال
(ج) انور علی (د) ان میں سے کوئی نہیں

(39) مندرجۂ ذیل میں سے کون سی کتاب کنہیا لال کپور کی نہیں ہے؟

(الف) سنگ وخشت (ب) چنگ ورباب
(ج) شام وسحر (د) نوک ونشتر

(40) ''حماقتیں'' کا مصنف کون ہے؟
(الف) جوہر سیوانی (ب) ماچس لکھنوی
(ج) شفیق الرحمان (د) کنہیالال کپور

(41) ''کارٹون'' کس کی تخلیق ہے؟
(الف) سید محمد حسنین (ب) رضا نقوی واہی
(ج) یوسف ناظم (د) شوکت تھانوی

(42) مندرجۂ ذیل میں سے کنہیالال کپور کا انشائیہ کون سا ہے؟
(الف) پیسہ
(ب) سسرال
(ج) اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے
(د) ان میں سے کوئی نہیں

(43) ''نیا پیسہ'' کس کا انشائیہ ہے؟
(الف) احمد جمال پاشا (ب) فرحت اللہ بیگ
(ج) خواجہ حسن نظامی (د) علی اکبر قاصد

(44) ''غسلیات'' کے مصنف کا نام بتائیے؟
(الف) رشید احمد صدیقی (ب) کرشن چندر
(ج) میر ناصر علی (د) حاجی لق لق

(45) انجم مانپوری کے مشہور مزاحیہ مضمون کا نام کیا ہے؟
(الف) پٹنا (ب) جھینگر کا جنازہ
(ج) کرائے کی ٹم ٹم (د) اگر میں چور ہوتا

(46) ''ہیرو'' کس کا انشائیہ ہے؟
(الف) فرحت اللہ بیگ (ب) کرشن چندر
(ج) سید محمد حسنین (د) احمد جمال پاشا

(47) ''ادب میں مارشل لا'' کس کا مضمون ہے؟
(الف) احمد جمال پاشا (ب) فرقت کاکوروی
(ج) مجتبیٰ حسین (د) شفیقہ فرحت

(48) دلی کی ٹکسالی زبان کس ادیب کے انشائیوں اور مضامین میں ملتی ہے؟
(الف) فرحت اللہ بیگ (ب) خواجہ حسن نظامی
(ج) مشتاق احمد یوسفی (د) ان میں سے کوئی نہیں

(49) ''ترنگ'' کس کے انشائیوں کا مجموعہ ہے؟
(الف) علی اکبر قاصد (ب) نظیر صدیقی
(ج) احمد جمال پاشا (د) حسنین عظیم آبادی

(50) وزیر آغا کے انشائیوں کا مجموعہ کون سا ہے؟
(الف) شہرت کی خاطر (ب) خیال پارے
(ج) انشائیے (د) ہوائی قلعے

(جوابات اسی شمارے میں تلاش کریں)

□□□

164, Sabarmti Hostel,
JNU, New Delhi-110067

دیوناگری اور تصویروں کی مدد سے اردو سکھانے والی کتاب

اردو تصویری لغت مع ہندی

جدید طریقوں سے تیار کردہ کتاب۔ اردو سیکھنے کے شائق حضرات کے لیے نہایت عمدہ تحفہ۔ تصاویر اور ہندی کی مدد سے اردو خود بخود دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ اپنی طرز کی بالکل اچھوتی کتاب ہے۔ بہترین کتابت اور آفسیٹ کی طباعت کے ساتھ۔

سائز:23x38/8 صفحات:252 قیمت:-/30 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے %40 کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

محمد سہیم الدین

کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-3

بڑھتے قدم

جوہر پروین نے، جن کے والدین وکالت کے پیشے سے وابستہ ہیں، ابتدائی تعلیم اپنے شہر سوپور، بہار کے ایک مدرسے میں حاصل کی اور اس کے بعد بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ سے اردو میں عالم آنرز کیا، عالم آنرز کے بعد انہوں نے کونسل کا ایک سال کا ڈپلومہ اِن کمپیوٹر اپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی.ٹی.پی. کیا اور ابھی حال ہی میں انہوں نے اسی کمپیوٹر کورس کی بدولت ایک ادارے میں سروس جوائن کی۔ ان کا مختصر انٹرویو قارئینِ "اردو دنیا" کے لیے پیش ہے۔

سوال: کمپیوٹر سے آپ کو کیسے دلچسپی ہوئی؟

جواب: کمپیوٹر دورِ حاضر کی ایک اہم ضرورت ہے، اس کے ذریعے بہت سے ایسے امور انجام دیے جاتے ہیں جو اس کے بغیر مشکل ہی نہیں ایک حد تک ناممکن تھا۔ اس لیے دورِ حاضر میں کمپیوٹر سے دلچسپی رکھنا ہر کسی کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے باوجود اگر سچ کہوں تو مجھے کمپیوٹر سے دلچسپی کمپیوٹر سینٹر میں تعلیم پانے کے دوران ہی ہوئی۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر دوسرے سینٹروں سے کس اعتبار سے مختلف ہیں؟

جواب: ویسے تو کونسل کے کمپیوٹر سینٹرز کی بہت ساری امتیازی خصوصیات ہیں لیکن اس کی جو اہم خصوصیات ہیں، ان میں مناسب فیس اور کمپیوٹر کے ساتھ اردو کی تعلیم ہے۔ جو ہمارے لیے سب سے زیادہ پرکشش بنی۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں میں جو تربیت دی جارہی ہے، اس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: کافی مطمئن ہوں بلکہ پوری طرح مطمئن ہوں۔ کیوں کہ ہمیں اس تربیت سے وہ ساری چیزیں حاصل ہوجاتی ہیں جن کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو Well Trained محسوس کرسکتے ہیں۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر اردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرنے میں کس حد تک معاون ہیں؟

جواب: بہت زیادہ معاون ہیں، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، اس دور میں تعلیم حاصل کرنے سے کہیں زیادہ روزگار تلاش کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اب ایسے میں اگر آپ کے پاس کوئی ٹیکنیکل ہینڈ ہے تو میرے خیال میں ہوسکتا ہے کہ وقت لگے لیکن کامیابی ضرور ملے گی۔

سوال: انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا کا حصہ بن کر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟

جواب: ایسا محسوس ہورہا ہے کہ آج ہم وقت کی رفتار سے پیچھے نہیں ہیں بلکہ وقت کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکتے ہیں اور بہت ہی مختصر وقت میں اس انفارمیشن ٹیکنالوجی کی مدد سے کئی امور انجام دے سکتے ہیں۔

سوال: اس میدان میں آنے کے بعد کیا آپ میں کوئی بدلاؤ آیا ہے؟ کیا آپ کی خود اعتمادی اور خود انحصاری میں اضافہ ہوا ہے؟

جواب: خود اعتمادی اور خود انحصاری دونوں میں اضافہ ہوا ہے اور نہ صرف یہ کہ اضافہ ہوا ہے بلکہ آج ہمارے اندر جو خود اعتمادی ہے وہ شاید اسی کورس کی مرہونِ منت ہے۔

سوال: آپ لازمی طور پر ملٹی لنگول ہیں۔ یہ آپ کے لیے ایک بے حد مثبت چیز ہے۔ آپ اپنی اس خصوصیت کی بنا پر مارکیٹ میں اپنے آپ کو کس مقام پر پاتے ہیں؟

جواب: بہت بہتر مقام پر، دیکھیے آج کے دور میں ہر کوئی پروفیشنل ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ایک ہی آدمی سے ہر طرح کا کام لے۔ اس لیے ملٹی لنگول ہونا ہر کسی کے لیے فائدے کی بات ہے اور اس کی وجہ سے کسی کو بھی مواقع مل سکتے ہیں، جیسا کہ مجھے خود ملا ہے۔

سوال: آپ نے کمپیوٹر سینٹر میں جو فیس ادا کی، وہ آپ کے لیے بوجھ تو نہ تھی؟

جواب: کم از کم میں اپنی حد تک تو کہہ سکتی ہوں کہ مجھے اس کی ادائیگی قطعی بوجھ نہ لگی اور جہاں تک میرا خیال ہے، میرے کلاس کے دوسرے طلبہ کے لیے بھی فیس زیادہ نہ تھی۔ ☐☐☐

اردو خبرنامہ

چوتھا کل ہند اردو کتاب میلہ اور ریاستی اردو اکادمیوں کی چوتھی کانفرنس

● سرینگر، 6 ستمبر۔ قومی اردو کونسل کی طرف سے منعقدہ چوتھے کل ہند اردو کتاب میلے اور ریاستی اردو اکادمیوں کی چوتھی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے جموں وکشمیر کے وزیر اعلا جناب مفتی محمد سعید نے کہا کہ اس زبان پر ملک کی تقسیم اور فرقہ وارانہ سیاست کا سب سے زیادہ عتاب نازل ہوا ہے۔ انھوں نے ادیبوں سے اپیل کی کہ ہندستان کی اس زندہ وراثت کو فروغ دیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ معاشرے کی سماجی، اقتصادی جہات کا جو تعلق اس زبان سے ہے، اس کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو ایک شیریں زبان اور ملک کی شاندار مشترکہ تہذیب کی علامت ہے۔ آزادی کے بعد مدارس نے اس زبان کے فروغ اور تحفظ میں بڑے پیمانے پر خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ناشرین، مصنفین اور فروغ اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کی اس نمائش میں بڑی تعداد میں شرکت اس زبان کی مقبولیت کو ظاہر کرتی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان کے فروغ میں بالی ووڈ نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ممتاز گیت کار گلزار اور مرحوم کیفی اعظمی کی کاوشوں کو بھی سراہا۔ اس موقعے پر جناب گلزار بھی موجود تھے۔ وزیر اعلا نے انھیں گلدستہ پیش کیا۔

قومی اردو کونسل اور جموں کشمیر اکیڈمی آف آرٹ اینڈ کلچر کے اشتراک سے منعقد ہونے والے اس نو روزہ کل ہند اردو کتاب میلے میں ملک کے تقریباً تمام بڑے ناشرین و تاجران کتب بشمول ریاستی اردو اکادمیوں، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، رضا لائبریری، رام پور، عربک اینڈ پرشین انسٹی ٹیوٹ، ٹونک وغیرہ نے شرکت کی۔ میلے میں تقریباً 75 اسٹال لگے جن میں ہزاروں کتابیں موجود تھیں۔ اس سے قبل قومی اردو کونسل، دہلی میں دو اور ممبئی میں ایک کل ہند اردو کتاب میلہ منعقد کر چکی ہے۔

جناب مفتی محمد سعید نے کہا کہ اگرچہ اردو جموں اور کشمیر کی سرکاری زبان ہے لیکن عالمی پیمانے پر انگریزی کو رابطے کی زبان کے طور پر قبول کرنے پر زور اور نجکاری کی وجہ سے اردو کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ سرکاری اسکولوں میں بھی روزگار کی ضرورتوں کے مدِّ نظر پہلی جماعت سے ہی انگریزی کی تعلیم شروع کردی جاتی ہے۔

انھوں نے ریاست میں اردو کے فروغ کے لیے پیش کی گئی تجاویز پر غور کرنے اور ان پر عمل درآمد کی یقین دہانی بھی کرائی۔

جناب مفتی محمد سعید نے کمپیوٹر تربیت یافتہ بے روزگار نوجوانوں کے ایک گروپ کو یہ یقین دلایا کہ ان کے مطالبات پر بہت جلد غور کیا جائے گا۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے کمپیوٹر تربیتی مراکز قائم کرنے کے لیے ہر ممکن امداد کا وعدہ کیا۔

وزیر اعلا نے اس موقعے پر ''کشمیر انسائیکلوپیڈیا'' کی چوتھی جلد کا اجرا بھی کیا۔

جناب گلزار نے اس موقعے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ میلے میں نمائش کے لیے رکھی گئی کتابوں کو دیکھ کر ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اردو کا فروغ قابلِ اطمینان انداز میں ہو رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اعلا ٹیکنالوجی کے اس عہد میں اردو کو کمپیوٹر کے ذریعے دیگر زبانوں سے جوڑ کر اس کی جدید کاری کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ اس سلسلے میں قومی اردو کونسل کے اقدامات کی انھوں نے ستائش کی۔ جناب گلزار نے اس موقعے پر ماضی کے کتاب کلچر اور کمپیوٹر کے جدید مسحور کن عہد کا تقابلی جائزہ اپنی خوبصورت نظم ''کتابیں'' کے ذریعے پیش کیا۔

ممبر پارلیمنٹ پروفیسر سیف الدین سوز نے کہا کہ وادی میں پہلی بار اتنے بڑے پیمانے پر اردو کتب کی نمائش کا انعقاد کیا گیا ہے۔ انھوں نے وزیر اعلا جموں اور کشمیر سے اردو اور دیگر زبانوں کے فروغ کے لیے ایک کمیٹی بنانے اور مرکزی حکومت سے اردو بورڈوں کو مزید فنڈ فراہم کرنے کا مطالبہ کرنے کی گزارش کی۔ انھوں نے کہا کہ کمپیوٹر جاننے والے 2+10 پاس لڑکے اور لڑکیوں کو سرکاری نوکریوں میں اوّلیت دی جانی چاہیے۔

کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب جلیس احمد خاں ترین نے افتتاحی جلسے کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ اردو ایک عبوری دور سے گزر رہی ہے اور جموں اور کشمیر کے ساتھ ساتھ ملک کی دیگر ریاستوں میں بھی اردو کا مستقبل روشن ہے۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے اس موقعے پر فروغ اردو کے سلسلے میں اپنے ادارے کی طرف سے کیے جانے والے اقدامات کی تفصیل پیش کی۔ کلچرل اکیڈمی کے سکریٹری جناب بلونت سنگھ نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر کونسل کے اعلا عہدیداران، مختلف ریاستوں کے اردو بورڈوں کے عہدیداران، ممتاز مصنفین، ماہرینِ تعلیم اور سامعین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

یہ کتاب میلہ نو روز تک چلا جس میں فروختِ کتب کے ساتھ ساتھ مختلف ثقافتی پروگرام اور طلبہ کے لیے تعلیمی مقابلے بھی پیش کیے جاتے رہے۔ اس درمیان ریاستی اردو اکادمیوں کی چوتھی کانفرنس بھی منعقد ہوئی جس میں ملک کی تمام 15 ریاستی اکادمیوں اور قومی اردو کونسل کے مابین ایک مشترکہ حکمتِ عملی کے

تحت اردو کے کاز کو ملک گیر پیمانے پر آگے بڑھانے پر غور کیا گیا تاکہ باہمی اشتراک و روابط میں اضافہ ہو اور فروغ اردو کی پالیسیوں کو زیادہ بامعنی بنایا جا سکے۔

چوتھے کل ہند اردو کتاب میلے اور ریاستی اردو اکادمیوں کی چوتھی کانفرنس کا اختتامی اجلاس 14 ستمبر 2003 کو منعقد ہوا جس میں جموں اور کشمیر کے گورنر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ایس. کے. سنہا نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو ہماری قومی زبان ہے۔ یہ بہت دنوں تک فوج کی زبان رہی اور یہ زبان فوج کی چھاؤنی میں ہی پروان چڑھی۔ اردو مشترکہ ہندستانی تہذیب کی سب سے بڑی علامت ہے۔ اردو کلچر دراصل محبت اور بھائی چارے کا کلچر ہے۔ نہ صرف ملک بلکہ پورے جنوبی ایشیا میں امن اور استحکام کے لیے اس مشترکہ کلچر کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ آخر میں انھوں نے اقبال کے مصرعے

سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا

پر اپنی تقریر ختم کی۔ (ڈاک سے)

امیر خسرو پر مذاکرہ

● نئی دہلی، 19 اگست۔ ''طوطیِ ہند امیر خسرو نے ہندستان کے علمی، ادبی اور ثقافتی سرمائے میں بیش قیمت اضافہ کیا ہے اور ساتھ ہی ملک میں اتحاد، یک جہتی اور مذہبی ہم آہنگی کو بھی فروغ دیا ہے۔ امیر خسرو دراصل ان میں سے ایک ہیں جنھوں نے ملک میں سیکولرزم کی بنیادوں کو مضبوط اور مستحکم کیا ہے۔'' راجیہ سبھا کی ڈپٹی چیئر پرسن محترمہ نجمہ ہبت اللہ نے یہ الفاظ امیر خسرو کے 750 ویں سال پیدائش کے موقعے پر منعقدہ ایک تقریب میں کہے۔ اس تقریب کا اہتمام اندرا گاندھی نیشنل سینٹر فار آرٹس نے ساہتیہ اکادمی اور امیر خسرو اکادمی کے تعاون سے کیا تھا۔ ڈاکٹر نجمہ ہبت اللہ نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ امیر خسرو نے ہمیں ایک ایسی زبان دی جو آج ہماری قومی زبان ہے اور ہم جس یقین کے علمبردار ہیں اس کی ضرورت آج ساری دنیا کو ہے۔

اس تقریب میں اردو کے ممتاز ناقد اور ساہتیہ اکادمی کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ امیر خسرو اردو اور ہندی یا کھڑی بولی کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے عام آدمی کی زبان میں عام آدمی کے لیے شاعری کی۔ ہندی اور اردو دونوں زبانوں کی تعمیر و ترقی میں امیر خسرو کی حصے داری ناقابلِ فراموش ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ وہ شاعر، نثر نگار، صوفی، مؤرخ، ماہرِ لسانیات، فلسفی، مغنّی، موسیقار تو تھے ہی، ساتھ ہی انھوں نے کئی ساز بھی ایجاد کیے۔

اپنی صدارتی تقریر میں راجیہ سبھا کے ممبر اور اندرا گاندھی نیشنل سینٹر فار آرٹس کے صدر ڈاکٹر ایل. ایم. سنگھوی نے کہا کہ امیر خسرو ایک سچے محبِ وطن، عوامی فنکار، دانشور، مفکر اور شاعر تھے۔ وطن سے محبت ہی ان کا اصل ایمان تھا۔ عام ہندستانی کے سکھ دکھ کو انھوں نے اپنی فکر کا موضوع بنایا اور عوامی زبان میں ہی ادب تخلیق کیا۔ مسٹر سنگھوی نے اس موقعے پر ڈاکٹر پرمانند پانچال کی امیر خسرو پر لکھی ایک کتاب کا اجرا بھی کیا۔ افغانستان کے سفیر مسعود خلیلی اور ایران کلچر ہاؤس کے کونسلر مسٹر عیسیٰ رضا زادہ نے بھی امیر خسرو کی ہمہ گیر شخصیت پر اپنے خیالات ظاہر کیے۔ حیات خاں نظامی خسروی نے خسرو کا کلام قوالی کی شکل میں پیش کیا۔

دوپہر کے بعد دوسرا اجلاس جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر شاہد مہدی کی صدارت میں ہوا۔ یہ کھلا اجلاس تھا جس میں لوگوں نے اپنے اپنے خیالات ظاہر کیے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

جسٹس اے. ایم. احمدی اے. ایم. یو علی گڑھ کے چانسلر اور نواب چھتاری اعزازی خازن منتخب

● علی گڑھ، 15 ستمبر۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کی سالانہ میٹنگ میں سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس جناب اے. ایم. احمدی کو چانسلر، الامین تحریک بنگلور کے بانی ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کو پرو چانسلر اور نواب ابن سعید خاں آف چھتاری کو آنریری ٹریژرار منتخب کیا گیا۔ یہ سبھی عہدیداران اتفاق رائے سے چنے گئے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ایگزیکیٹو کونسل کی رکنیت کے لیے یونیورسٹی کورٹ کے چھ نمائندگان میں سابق ایم پی مسٹر وسیم احمد، وزارتِ خارجہ کے سابق سکریٹری مسٹر سلمان حیدر، سابق مرکزی وزیر مسٹر سلیم اقبال شیروانی، ماہرِ امراضِ قلب پروفیسر منصور حسن، ایگریکلچرل سروسز رکروٹمنٹ بورڈ کے رکن ڈاکٹر ایس. اے. ایچ. عابدی اور لوک سبھا کے رکن مسٹر ای. احمد کو بلا مقابلہ منتخب قرار دیا گیا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کی رکنیت کے لیے مختلف زمروں سے 42 ممبران کا انتخاب عمل میں آیا۔ مختلف پیشوں کے ماہرین، صنعت اور تجارت سے دس نمائندوں کے انتخاب میں سلمان خورشید، سلیم اقبال شیروانی، سلمان حیدر، سردار عثمان علی خاں، ایم اے پٹھان، ایس اے ایچ عابدی، منصور حسن، وسیم احمد، سید شہاب الدین اور پروفیسر امریک سنگھ کو چنا گیا ہے۔ مسلم تہذیب و ثقافت کے پندرہ نمائندوں میں جاوید اختر، نواب رحمت اللہ خاں شیروانی، کنور عمار احمد خاں، شیروانی، سید ظہور قاسم، سید کلب صادق، سید شاہد مہدی، سید ایس شفیع، شاہد حسین خاں، مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی، جسٹس خواجہ محمد یوسف، ڈاکٹر انور عالم، مولانا عبدالبقا ندوی، موسیٰ رضا، جسٹس صغیر احمد اور احمد عبدالحئی چن لیے گئے ہیں۔

علوم مشرقیہ کے مسلم کالجوں کے لیے چھ نمائندوں کے لیے مولانا محمد رابع حسنی ندوی، مولانا عبدالکریم پاریکھ، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مولانا فضل الرحیم مجددی، مولانا سید محمد ولی رحمانی اور جناب مبارک پاشا انتخاب جیت گئے ہیں۔

ملک بھر کے مسلم اوقاف کے چار نمائندوں کی کورٹ میں رکنیت کے لیے پروفیسر کے اے جلیل، امیر عالم خاں، نجم الحسن رضوی اور جسٹس اے جی قریشی بلا مقابلہ منتخب قرار دیے گئے ہیں۔

اردو زبان و ادب کی نمائندگی کے زمرے میں کورٹ کی رکنیت کے لیے ممتاز نقاد شمس الرحمان فاروقی اور شہریار اتفاقِ رائے سے چن لیے گئے ہیں جبکہ مسلم تعلیمی اور ثقافتی انجمنوں کے پانچ نمائندوں کا انتخاب بھی اتفاق رائے سے عمل میں آیا ہے۔ وہ ہیں بی شیخ علی، نصرت شروانی، محمد اسحاق جم خانہ والا، منور پیر بھائی اور منظور عالم۔ مسلم یونیورسٹی کورٹ کی سالانہ میٹنگ کی صدارت وائس چانسلر مسٹر نسیم احمد نے کی۔ قانون فیکلٹی کے ڈین پروفیسر اسحاق قریشی کو چیف الیکشن کمشنر مقرر کیا گیا تھا اور ان کی مدد کے لیے شعبۂ صحافت کے چیئرمین شافع قدوائی اور شعبۂ زولوجی کے چیئرمین محشر رضا نے اسسٹنٹ الیکشن کمشنر کے فرائض انجام دیے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

م.افضل اردو اکادمی، دہلی کے نئے وائس چیئرمین

● نئی دہلی، 11 ستمبر۔ دہلی حکومت نے اردو اکادمی، دہلی کی گورننگ کونسل کی تشکیلِ نو کا اعلان آج کر دیا ہے۔ نئی گورننگ کونسل کے کل ممبران کی تعداد 24 ہے۔ ان کے علاوہ چیئرمین اور وائس چیئرمین ہیں۔ اس مرتبہ اردو اکادمی دہلی کا وائس چیئرمین ممتاز صحافی، سیاست داں اور راجیہ سبھا کے سابق ممبر جناب م.افضل کو بنایا گیا ہے۔

اردو اکادمی کے سکریٹری جناب مرغوب حیدر عابدی کے جاری کردہ بیان کے مطابق گورننگ کونسل میں اردو اکادمی کے سابق سکریٹری مسٹر شریف الحسن نقوی، سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند، ڈاکٹر خلیق انجم، معروف شاعر اور سہ ماہی رسالہ ''استعارہ'' کے مدیرِ اعلا مسٹر صلاح الدین پرویز، ڈاکٹر خالد محمود اور مولانا آزاد یونیورسٹی کے دہلی زون کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شاہد پرویز کو شامل کیا گیا ہے۔

دیگر ممبران میں ڈاکٹر علی جاوید، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، پروفیسر ظفر احمد نظامی، سردار نرمل سنگھ نرمل، ڈاکٹر زبیدہ حبیب، ڈاکٹر عقیل احمد، ڈاکٹر اصرار حسین، ڈاکٹر شاہد حسین، شیخ منظور احمد، سردار شمشیر سنگھ شیر، محترمہ سیدہ چشتی، مسٹر ایس. زیڈ. احمد، مسٹر اظہار عثمانی، مسٹر محمد شعیب مرزا اور مسٹر محمد یوسف کو نامزد کیا گیا ہے۔ دہلی حکومت کے پرنسپل سکریٹری (مالیات)، سکریٹری (لسانیات آرٹ اور ثقافت) اور سکریٹری اردو اکادمی بھی ممبر ہوں گے۔

اردو اکادمی کے نئے وائس چیئرمین مسٹر م.افضل نے اپنی نامزدگی پر ردِعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ دہلی حکومت نے ایک ذمے داری میرے سپرد کی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس بہانے اردو کی خدمت کرنے کا موقع ملے گا۔ میرا اوڑھنا اور بچھونا بھی اردو زبان ہی ہے، لہٰذا میری کوشش ہوگی کہ راجدھانی میں ہر سطح پر اردو کو فروغ حاصل ہو۔ امید ہے کہ یہ گورننگ کونسل شہر میں اردو کی تعمیر و ترقی اور تخلیقی ادب کی حوصلہ افزائی کے لیے سنجیدگی سے سرگرم ہوگی۔ قابل ذکر ہے کہ پچھلی گورننگ کونسل کی مدتِ کار جولائی میں ختم ہوگئی تھی۔ نئی کونسل دو سال تک کام کرے گی۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

مالیرکوٹلہ میں دوروزہ قومی اردو سمینار

● مالیرکوٹلہ۔ پنجابی یونی ورسٹی پٹیالہ کے زیرِ اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی کے تعاون سے نواب شیر محمد خاں انسٹی ٹیوٹ آف پنجابی یونی ورسٹی مالیرکوٹلہ میں گذشتہ دنوں دو روزہ اردو سمینار کا انعقاد ہوا جس کی صدارت پدم شری، کیرتی چکر جناب سورن سنگھ بوپارائے (وائس چانسلر پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ) نے فرمائی۔ سمینار میں مہمانِ خصوصی ممتاز محقق و نقاد پروفیسر نثار احمد فاروقی تھے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو بطور مہمانِ اعزازی تشریف لانا تھا لیکن موصوف اپنی گوناگوں مصروفیات کی بنا پر شرکت نہ کر سکے۔ مفتی پنجاب جناب فضیل الرحمان ہلال عثمانی بحیثیت مہمانِ اعزازی اسٹیج پر تشریف فرما تھے۔ ان کے علاوہ پروفیسر یو.بی. سنگھ ڈین آف فیکلٹی پنجابی یونیورسٹی، پروفیسر منشاء الرحمان خاں منشا، پروفیسر عتیق اللہ اور پروفیسر عبدالحق بھی اسٹیج پر موجود تھے۔

سمینار کے آغاز میں پروفیسر یو.بی. سنگھ نے مہمانانِ گرامی کا استقبال کیا۔ پروفیسر زینت اللہ جاوید صدر انسٹی ٹیوٹ مالیرکوٹلہ نے مہمانوں کا تعارف پیش کیا اور انسٹی ٹیوٹ کی کارکردگی کا مفصل ذکر کیا۔ بعد ازاں ایس.ایس. بوپارائے نے اپنی افتتاحی تقریر میں نواب شیر محمد خاں مالیرکوٹلہ کے ان احتجاجی کلمات کا حوالہ دیا جو نواب مالیرکوٹلہ نے گرو گوبند سنگھ جی کے بچوں کو سرہند شریف میں زندہ دیوار میں چنوا دیے جانے کے حکم پر ایک خط کی صورت میں ادا کیے تھے۔ یاد رہے کہ مالیرکوٹلہ میں یونیورسٹی کا یہ ایڈوانسڈ اسٹڈی سینٹر نواب شیر محمد خاں کے نام معنون کیا گیا ہے جہاں اردو، فارسی اور عربی سرٹیفکیٹ کورسیز اور ایم.اے. فارسی کے علاوہ فارسی، اردو میں تحقیقی کام کروایا جاتا ہے۔ جناب بوپارائے نے اپنے افتتاحیہ خطبے میں اس خط کی نقل سامعین کو پڑھ کر سنائی جو نواب مالیرکوٹلہ نے اورنگ زیب کے نام تحریر کیا تھا۔ اس کے ساتھ پنجاب میں اردو، فارسی زبان و ادب کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے موصوف نے سمینار کے موضوع ''اردو زبان

وادب میں پنجاب کی اہمیت'' پر روشنی ڈالی۔

جناب فضیل الرحمان ہلال عثمانی نے اپنی تقریر میں اردو زبان وادب کی قومی خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے نئے امکانات تلاش کرنے پر زور دیا۔ آخر میں انسٹی ٹیوٹ کے ریڈر ڈاکٹر محمد جمیل نے مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

سیمینار کے پہلے سیشن کی صدارت پروفیسر نثار احمد فاروقی نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر طارق کفایت نے ادا کیے۔ اس میں جن مقالہ نگاروں نے اپنے مقالہ جات پیش کیے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ پروفیسر ظہورالدین '' اردو ناول اور تقسیم''، پروفیسر عبدالحق '' علمی وتفکری پہلو (پنجاب کے حوالے سے)''، پروفیسر عتیق اللہ '' روایت اور روایت شکنی: پنجاب کے تناظر میں''، ڈاکٹر شہاب عنایت ملک '' ایک چادر میلی سی میں سماجی ماحول''۔

سیمینار کے دوسرے سیشن میں صدارت کے فرائض پروفیسر عبدالحق نے انجام دیے اور نظامت کی ذمے داری ڈاکٹر طارق کفایت نے سنبھالی۔ اس سیشن میں جن مقالہ نگاروں نے اپنے مقالات پیش کیے، ان کے اسمائے گرامی ہیں:

پروفیسر منشاء الرحمان خاں '' اردو افسانہ اور پنجاب''، ڈاکٹر تابش مہدی '' تلوک[redacted]ند محروم: ایک سچا وطن دوست شاعر''، پروفیسر برکت علی '' پنجاب میں اردو کا مستقبل''، ڈاکٹر ناشر نقوی '' پنجاب کے افسانہ نگار''۔

تیسرا سیشن پروفیسر مظفر حنفی کی صدارت میں ہوا جس میں موصوف نے اپنا مقالہ بھی بعنوان '' بلونت سنگھ کی تخلیقات میں پنجاب'' پیش کیا۔ اس سیشن کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد جمیل نے ادا کیے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر امرونت سنگھ نے '' اردو فارسی کے اثرات پنجابی زبان پر''، رضا زیدی نے '' پنجاب کو اردو ادب کی ایک دین: زار علامی'' اور ڈاکٹر طارق کفایت نے '' پنجاب کی یونیورسٹیوں میں اردو فارسی تحقیق'' پر اپنے مقالے پیش کیے۔ سیمینار کی اختتامی تقریب پروفیسر آر. این. پال پرووائس چانسلر پنجابی یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔

(ڈاک سے)

'' سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک'' پر مذاکرہ

● علی گڑھ، 21 راگست۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ویمنس پالی ٹیکنک میں '' سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک'' پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وائس چانسلر نسیم احمد نے کہا کہ سرسید عظیم مصلح قوم تھے۔ انھوں نے معاشرے کی اصلاح کے لیے ہی تعلیم کو بنیاد بنایا اور اس عظیم دانش گاہ کو قائم کیا۔ انھوں نے کہا کہ سرسید تعلیم نسواں کے زبردست حامی تھے اور ان کا خیال تھا کہ خواتین کو تعلیم سے آراستہ کر کے ہی آنے والی نسلوں کو سدھارا جاسکتا ہے۔ وائس چانسلر نے کہا کہ اس یونیورسٹی نے معاشرے کے ہر میدان میں نامور شخصیات پیدا کی ہیں جن میں بڑی تعداد میں خواتین بھی شامل ہیں۔

'' سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک'' پر خصوصی مقرر کی حیثیت سے بولتے ہوئے شعبۂ انگریزی کے سربراہ پروفیسر فرحت اللہ خاں نے کہا کہ اس دانش گاہ کے تئیں اپنے فرائض کو انجام دینے کے لیے سبھی کو سخت جانفشانی کے ساتھ تعلیم حاصل کرنی چاہیے اور یہاں کی زریں روایات کو برقرار رکھنا چاہیے اور ان کے کارناموں کو پڑھنا چاہیے اور ان کو اپنی زندگی میں اوّلیت دینی چاہیے۔ فیکلٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کے ڈین پروفیسر ایس باسو نے تعلیم نسواں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ویمنس کالج کے بانی شیخ عبداللہ کا نام تاریخ کا سنہرا باب بن گیا ہے۔ حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے ویمنس پالی ٹیکنک کے پرنسپل پروفیسر فہیم احمد نے خواتین میں تکنیکی تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ سماج میں بلند مقام حاصل کرنے کے لیے طالبات کو سخت محنت کرنی چاہیے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

غالب ہندستان اور تاشقند کے درمیان ایک مستحکم رشتے کی علامت

● نئی دہلی، 8 راگست۔ اردو اکادمی، دہلی کی جانب سے سید عاشور کاظمی (لندن)، پروفیسر آزاد شاماتوف (تاشقند) اور ڈاکٹر تش مرزا (تاشقند) کو آج غالب اکادمی حضرت نظام الدین میں استقبالیہ دیا گیا جس کی صدارت پروفیسر قمر رئیس نے کی جبکہ ازبکستان کے سفیر ابراہیم مالانوف نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ اکادمی کے سکریٹری مرغوب حیدر عابدی نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ ملک سے ہزاروں میل دور یہ لوگ اردو زبان وادب کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اکادمی کو ان کا استقبال کرتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر قاضی عبیدالرحمان ہاشمی نے اس موقعے پر پروفیسر آزاد شاماتوف کی لسانی خدمات کا خصوصیت سے تذکرہ کیا۔ تش مرزا کے بارے میں انھوں نے کہا کہ ان کی زبان سن کر ہمیں رشک آتا ہے۔ وسطی ایشیا میں اردو کے فروغ میں ان کی کوششیں قابل ستائش ہیں۔ عاشور کاظمی سے متعلق پروفیسر ہاشمی نے کہا کہ لندن میں اردو کی جو شمع جل رہی ہے اس میں عاشور کاظمی کی کوششوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ تش مرزا اور آزاد شاماتوف نے اردو کے لیے جو کام انجام دیے ہیں، وہ طلبہ کے لیے ہی نہیں ہمارے لیے بھی مشعل راہ ہے۔ ڈاکٹر تش مرزا نے اپنی تقریر میں کہا کہ مرزا غالب ہندستان سے تاشقند کو ملانے والا ایک مستحکم رشتہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے یہاں غالب کے خطوط کی لسانی اہمیت پر کام ہو رہا ہے۔ عاشور کاظمی نے کہا کہ

لندن میں اردو کی تدریس کا سلسلہ شروع کرانے کی کوشش جاری ہے۔ آزادشاما توف نے کہا کہ اردو ایک بین الاقوامی زبان ہے۔ صدر جلسہ پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ تاشقند میں اردو زبان ہی نہیں، اردو تہذیب کو بھی فروغ حاصل ہوا ہے اور آزادی کے بعد سے ہی وہاں اردو اور ہندی سیکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔ دریں اثنا ڈاکٹر تش مرزا کی دہلی آمد پر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بھی استقبالیہ تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی نے خیر مقدمی کلمات میں ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر پروفیسر اختر الواسع، ڈاکٹر خالد محمود، ڈاکٹر وہاج الدین علوی، ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، عبد الرشید اور خالد بشر بھی موجود تھے۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر شہپر رسول نے کی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

رحمانی فاؤنڈیشن انٹرنیٹ سے جُڑا

● مونگیر، 18 راگست۔ رحمانی فاؤنڈیشن، مونگیر کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے منظور شدہ تعلیمی ادارے رحمانی کمپیوٹر سینٹر کو انٹرنیٹ سے جوڑ دیا گیا اور رحمانی فاؤنڈیشن کے شعبۂ ہیلتھ کیئر کے تحت ہونے والے آپریشن کیمپ اور لینس کیمپ کے موقعے پر مریضوں کی خدمت کرنے والے رحمانی کمپیوٹر سینٹر کے طلبہ کو انسانی خدمت کے لیے سرٹیفکیٹ سے بھی نوازا گیا۔ انٹرنیٹ کا افتتاح مونگیر صدر کے ڈی ایس پی پنکج سنہا نے کیا جب کہ رضا کار طلبہ کو سرٹیفکیٹ مونگیر ایس ڈی او موہن پرساد نے دیا۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے پنکج سنہا نے کہا کہ انٹرنیٹ سے جڑنے سے رحمانی کمپیوٹر سینٹر میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی مدد سے نئی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ مولانا محمد ولی رحمانی اس ادارے کے چیئرمین ہیں، ان کی تجربہ کارذات کی توجہ سے یہ ادارہ مزید ترقی کرے گا۔ موہن پرساد نے کہا کہ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ رحمانی کمپیوٹر سینٹر میں کمپیوٹر کی تعلیم کے ساتھ ساتھ انسانی خدمت کا جذبہ بھی ابھارا جاتا ہے اور اس سلسلے میں تربیت بھی دی جاتی ہے۔ **(قومی آواز، نئی دہلی)**

اردو ریفریشر کورس

● نئی دہلی، 12 راگست۔ اکیڈمک اسٹاف کالج، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام اردو ریفریشر کورس کا افتتاح کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عاشور کاظمی نے اساتذہ سے کہا کہ آپ لوگ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو نسلوں کی تربیت کا موقع ملا ہے۔ انھوں نے انگلستان میں جاری اردو تعلیم کی ترویج و اشاعت کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی اور یہ تجویز پیش کی کہ لندن میں جو اساتذہ اردو کی خدمت پر مامور ہیں، ایسی کوئی شکل بنے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا اکیڈمک اسٹاف کالج ان کے لیے بھی اپنی خدمات پیش کرے اور یہاں کے اساتذہ کو بھی لندن میں تعلیمی امور کے لیے تربیت دی جائے۔ اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر پروفیسر اختر صدیقی نے کہا کہ ڈاکٹر عاشور کاظمی اردو کی نئی بستیوں کی تہذیب و ثقافت کے علم بردار ہی نہیں ہیں بلکہ ہندستان اور برطانیہ کے رشتوں کو زبان و ادب کے ذریعے مستحکم کرنے کا وسیلہ بھی ہیں۔ پروگرام کے کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر خالد محمود نے تین ہفتوں تک جاری رہنے والے ریفریشر کورس کے موضوع ''غزل ابتدا سے عہدِ حاضر تک'' کا تفصیلی تعارف اور خاکہ پیش کیا اور کورس میں شریک اساتذہ کو بتایا کہ غزل کے مختلف گوشوں اور عنوانات پر سیر حاصل گفتگو کرنے کے لیے کن کن شخصیات کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ ڈین فیکلٹی آف ہومنٹیز اینڈ لینگویجز پروفیسر اختر الواسع نے صدارتی خطاب میں کہا کہ زبان و ادب کے خدمت گاروں کو جامعہ نے ہمیشہ غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ آج سید عاشور کاظمی کے ہاتھوں ریفریشر کورس کا افتتاح بھی اسی روایت کا غماز ہے۔ انھوں نے جامعہ اور برطانیہ کے مابین اردو اساتذہ کی تربیت کے لیے سید عاشور کاظمی کی تجویز کو سراہا اور کہا کہ اس کو عملی شکل دینے کے لیے اکیڈمک اسٹاف کالج کو کوشش کرنی چاہیے۔

(قومی آواز، نئی دہلی)

غالب پر توسیعی خطبہ

● حیدرآباد، 25 راگست۔ شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کی جانب سے کانفرنس ہال میں 23 راگست کو ''غالب اور عصری حسیت'' کے زیر عنوان پروفیسر ضیاء الدین احمد شکیب اور پروفیسر شارب ردولوی نے توسیعی لیکچر دیا۔ صدارت کے فرائض پروفیسر افضل الدین اقبال صدر شعبۂ اردو نے انجام دیے۔ پروفیسر افضل الدین اقبال نے استقبالیہ کلمات کے ساتھ مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ جس کے بعد اپنے توسیعی خطبے کا آغاز کرتے ہوئے پروفیسر شارب ردولوی نے عصری حسیت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ غالب کے دور میں تین قسم کی حسیتوں کی نمائندگی کی گئی جس میں ذوق کی حسیت نے اپنے دور سے مطمئن ہونے کا ثبوت پیش کیا اور مومن نے اپنے دور سے مطمئن نہ ہوتے ہوئے، ماضی کی شان و شوکت واپس لوٹنے کی نمائندگی کی جبکہ تیسری حسیت مرزا غالب کی ہے، جنھوں نے غم گسار ہونے یا خوف کے ماحول میں زندگی گزارنے کے بجائے مستقبل کی نمائندگی کی۔ پروفیسر شارب ردولوی نے غالب کے فارسی اور اردو اشعار کے حوالے بھی پیش کیے۔ پروفیسر بیگ احساس نے پروفیسر شارب ردولوی اور ضیاء الدین احمد شکیب کی خصوصی خطاب میں غالب کی عصری حسیت کے زیر عنوان فصیح و بلیغ اور معلومات افزا مقالہ پیش کرنے پر ستائش کی۔ اس توسیعی خطبے میں عربی، فارسی اور اسلامک اسٹڈیز کے طلبہ اور اساتذہ

نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ ڈاکٹر مجید بیدار کی نظامت اور شکریہ پر اس نشست کا اختتام عمل میں آیا۔ (منصف، حیدرآباد)

اردو کو نظرانداز کرنا تہذیب وثقافت سے روگردانی

● 18 ؍اگست۔ برطانوی ایوانِ پارلیمنٹ میں پچھلے دنوں ایک استقبالیہ تقریب میں تقریر کرتے ہوئے ممتاز دانشور، نقاد اور ساہتیہ اکادمی کے چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ اردو تمام تر مشکلات اور دقتوں کے باوجود جنوبی ایشیا اور برِصغیر ہند و پاک کی اہم ترین زبان ہے۔ جس کو نظرانداز کرنا تہذیب وثقافت سے روگردانی کے مترادف ہے۔ موجودہ عہد کی کشیدگی، عصبیت اور بڑھتی ہوئی فرقہ واریت کے باوجود اردو آج بھی انسانیت، آشتی و رواداری کی اپنی صدیوں پرانی صالح روایت پر قائم ہے۔

تقریب کا اہتمام لیبر پارٹی کے ممبر پارلیمنٹ مسٹر جان میک ڈونالڈ اور کونسلر وریندر شرما کی جانب سے افروایشین سولیڈریٹی اور یوروپین اردو اسٹڈیز سوسائٹی نے کیا تھا۔ پروفیسر محمد عارف، جنرل سکریٹری افروایشین سولیڈریٹی نے خیرمقدم کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے لیے یہ بات باعثِ فخر ہے کہ اس کا نمائندہ ساہتیہ اکادمی کا صدر چنا گیا ہے۔ انھوں نے برطانوی پارلیمنٹ اور مدبّرین کی اردو سے قدیمی وابستگی کا ذکر کیا اور بتایا کہ بلیک فرائیرز میں انڈیا آفس کا قلمی ذخیرہ منتقل ہو چکا ہے اور اردو مخطوطات کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔

مسٹر جان میک ڈونالڈ ایم. پی. نے ملکہ وکٹوریہ کی اردو سے محبت کا ذکر کیا۔ علاوہ ازیں لندن میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ہندستانی ہائی کمیشن کے ثقافتی مرکز نہرو سینٹر میں بھی خطبہ پیش کیا۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

فراق گورکھپوری کی یاد میں ادبی نشست

● الہ آباد، 28 ؍اگست۔ ادبی وثقافتی تنظیم ''قلم کار'' کی جانب سے فراق گورکھپوری کی یومِ پیدائش کے موقعے پر ایک نثری وطرحی شعری نشست کا اہتمام اردو گھر، الہ آباد میں کیا گیا۔ جس کی صدارت پروفیسر فضل امام رضوی (سابق صدر، شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی) نے کی اور ڈاکٹر علی احمد فاطمی ریڈر شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی) نے اپنا مقالہ ''فراق کی دانشوری'' کے عنوان سے پیش کیا۔ طرحی شعری نشست کی صدارت شبنم نقوی نے کی۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے اپنے مقالے میں کہا کہ یہ سچ ہے کہ فراق اقبال کی طرح فلسفی نہیں تھے لیکن اس سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ وہ دانشور تھے اور حالات کو غور سے دیکھتے تھے، اس پر غور وفکر کرتے تھے۔ فراق نے سیکولر ہندستان کو بغور دیکھا اور سمجھا تھا اور اسی بنیاد پر انھوں نے اپنی شاعری کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے کہا کہ فراق کے یہاں دیومالائی تہذیب کے نمونے جگہ جگہ ملتے ہیں جس میں ہندستان کی جیتی جاگتی تصویر ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہے۔

صدارتی کلمات میں پروفیسر فضل امام رضوی نے کہا کہ دانشوری اور دانشمندی دراصل دو لفظ ہیں جن میں بڑا باریک سا فرق ہے اور یہی فرق ہماری تہذیب کا سرمایہ ہے۔ شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے فضل امام رضوی نے کہا کہ شاعری شعریت چاہتی ہے، لہٰذا شعریت کے بغیر شاعری ممکن نہیں ہے۔

نثری حصے کے بعد طرحی شعری نشست ہوئی جس میں قلم کار کی طرف سے دیے گئے مصرعۂ طرح ''تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں'' اور ''شامِ غم کچھ اس نگاہِ ناز کی باتیں کرو'' پر شعرا کرام نے اپنی غزلیں پیش کیں۔ (ڈاک سے)

قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری پر ادبی نشست

● حیدرآباد۔ 21 ؍اگست ''قرۃ العین حیدر اردو زبان کی ایسی نابغۂ روزگار ہستی ہیں کہ انھیں بجا طور پر Living Legend کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں ایک تہذیب کی تاریخی اور سماجی تصویر کی بھرپور عکاسی کی ہے''۔ ان خیالات کا اظہار جناب ایم اے رشید درّانی نے ادارہ تہذیبِ ادب کی طرف سے منعقدہ اسٹڈی سرکل کی ایک ادبی نشست میں کیا۔ اس ادبی نشست میں انھوں نے نامور ناول نگار محترمہ قرۃ العین حیدر کے فن اور شخصیت پر ایک مبسوط مقالہ پیش کیا۔ اس کی صدارت ڈاکٹر یوسف اعظمی نے کی۔ اس مقالے میں فاضل مقالہ نگار نے قرۃ العین حیدر کے خاندانی پس منظر، ان کی تعلیم وتربیت، تہذیبی ماحول اور مشاغل کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ قرۃ العین حیدر کے ناول بیک وقت تاریخ، تمدن، مذہب اور تہذیبوں کے عروج وزوال کی مستند داستان ہیں۔ ماحول کی منظرکشی اور کرداروں کے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے قرۃ العین حیدر کی ہمسری کسی اور ادیب سے ناممکن نظر آتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کے نظریۂ آزادیِ نسواں کا ذکر کرتے ہوئے جناب رشید درّانی نے کہا کہ نذر سجاد حیدر (قرۃ العین حیدر کی والدہ) کے قلم نے آزادیِ نسواں کا جو بیڑہ اٹھایا تھا، اسے بیٹی نے کمال عروج تک پہنچا دیا۔ (منصف، حیدرآباد)

خدابخش لائبریری میں یومِ خدابخش تقاریب

● پٹنہ۔ خدابخش لائبریری میں ہر سال 2-3 اگست کو یومِ خدابخش تقریبات کا انعقاد ہوتا ہے۔ اس سال 2 ؍اگست کی شام ''مسلمانوں کی تعلیمی صورتِ حال پر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے حکیم سید ایوب علی قاسمی نے خدابخش یادگاری خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی شاندار روایت کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ تعلیمی صورتِ حال پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور مسلمانوں کو تعلیم سے رشتہ جوڑنے کی ترغیب دی۔ جلسے کی صدارت جناب پروفیسر علاء الدین

احمد سابق وائس چانسلر، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی نے فرمائی۔ موصوف نے مسلمانوں کو تن آسانی ختم کرنے اور عملی میدان میں اپنے جوہر دکھانے کی ترغیب دی۔ شرکائے جلسہ میں سے ڈاکٹر رضوان احمد، ڈاکٹر رضی احمد، پروفیسر ندر احسن اور جناب شفیع مشہدی نے بھی مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ شروع میں ڈائرکٹر خدابخش لائبریری نے توسیعی خطبات کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی اور جناب ایوب علی کا حاضرین سے تعارف کرایا۔

دوسرے دن 3 راگست کی صبح کو بانیِ کتب خانہ کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی کا اہتمام کیا گیا اور بعد نمازِ مغرب جلسۂ سیرت النبی کا انعقاد ہوا۔ شیخ الحدیث مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ مولانا محمد قاسم قاسمی نے رسول کی سیرت بیان کی اور جناب مولانا نظام الدین امیر شریعت بہار واڑیسہ نے جلسے کی صدارت فرمائی۔ آخر میں ڈائرکٹر خدابخش لائبریری نے مقررین اور حاضرینِ محفل کا شکریہ ادا کیا۔ **(ڈاک سے)**

اردو اساتذہ کے تقرر کی یقین دہانی

● نئی دہلی، 17 راگست۔ ساہتیہ اکادمی کے چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر جمیل اختر، جنرل سکریٹری انٹرنیشنل اردو فاؤنڈیشن کی سربراہی میں اردو فاؤنڈیشن کا ایک وفد مسز شیلا دکشت، وزیرِ اعلا، دہلی سے ملا۔ وفد نے وزیرِ اعلا کو دوسری سرکاری زبان بنانے پر مبارکباد دی اور اس بل کے فوری نفاذ کے سلسلے میں چند مشورے دیے۔ وفد نے اردو اسکولوں میں مدتوں سے خالی اردو اسامیوں کو فی الفور بھرنے کا مطالبہ کیا اور جن اسکولوں میں اساتذہ کی جگہ نہیں ہے، وہاں اسامیاں لاکر جگہ پر کرنے کے مطالبے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ اردو کے اساتذہ جو دوسرے مضامین پڑھا رہے ہیں، ان کو فوراً اردو پڑھانے پر مامور کیا جائے۔ وفد نے ڈی.ٹی.سی. کی بسوں پر اردو میں روٹ پلیٹ لگانے، سڑکوں کے نام صحیح اردو میں لکھوانے، دفتروں میں ناموں کی تختیاں اردو میں لگانے اور محکموں کے نام اردو میں لکھوانے کے لیے وزیرِ اعلا کی توجہ مبذول کرائی۔ وفد نے قانونِ اردو کے نفاذ کے سلسلے میں ایک اردو سیل بنانے کا مطالبہ کیا اور محکمۂ السنہ میں مدتوں سے خالی اردو مترجم کی جگہ کو فوری طور پر بھرنے کا بھی مطالبہ کیا۔ تمام مطالبات کو وزیرِ اعلا نے سنجیدگی سے سنا اور عمل درآمد کی یقین دہانی کرائی۔ وفد میں ڈاکٹر شاہد حسین، ڈاکٹر اوم پرکاش سنگھ، ڈاکٹر نجیب اختر، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، بشیر احمد خاں، شہاب الدین احمد اور ڈاکٹر مشتاق صدف شامل تھے۔ **(قومی آواز، دہلی)**

اقلیتی طالبات کے لیے قومی وظائف

● نئی دہلی، 2 راگست۔ مولانا آزاد ایجوکیشنل فاؤنڈیشن نے اقلیتی فرقے سے تعلق رکھنے والی ہونہار طالبات کے لیے مولانا آزاد قومی اسکالرشپ اسکیم شروع کی ہے۔ اقلیتی فرقے کی غریب طالبات میں صلاحیت کو پہچاننے اور انھیں فروغ دینے کے علاوہ اس اسکیم کا مقصد انھیں اپنی تعلیم جاری رکھنے میں تعاون کے لیے مالی امداد فراہم کرنا ہے۔ فاؤنڈیشن کے ذریعے 10000 روپے فی کس کی شرح سے 1200 اسکالرشپ دی جائیں گی۔ اسکالرشپ کی رقم ادارے کی فیس کی ادائیگی، کتابوں اور کاپی، قلم کی خریداری اور قیام وطعام کی ادائیگی کے لیے ہوگی۔ نوٹیفائیڈ اقلیتوں یعنی مسلمانوں، عیسائیوں، بودھوں، سکھوں اور پارسی طالبات جنھوں نے تسلیم شدہ مرکز یا اسٹیٹ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن سے سیکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ امتحان میں کم از کم 55 فیصد نمبر حاصل کیے ہوں، اسکالرشپ دی جائے گی۔ اہلیت کا دوسرا اہم پیمانہ یہ ہے کہ طالب علم کے والدین کی آمدنی تمام وسائل سے سالانہ ایک لاکھ روپے سے کم ہو۔ اہل طالبہ کا گیارھویں درجہ ڈپلومہ ان انجینئرنگ، آئی ٹی آئی میں داخلہ ہو۔ اسکالرشپ کے لیے اہل طالبہ کو داخلہ دینے والی یونیورسٹیاں، کالج یا دیگر ادارے اتھارٹی کے ذریعے تسلیم شدہ ہونے چاہئیں۔

سماجی انصاف اور تفویضِ اختیار کی وزارت نے رواں مالی سال کے لیے مولانا آزاد ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کو اسکالرشپ اسکیم کے لیے 1.20 کروڑ روپے فراہم کرائے ہیں۔ وزارت نے فاؤنڈیشن کو مولانا آزاد نیشنل لٹریسی ایوارڈز کے لیے بھی 10 لاکھ روپے فراہم کیے ہیں۔ خاص طور سے تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتوں سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں میں عام اور تکنیکی تعلیم کو فروغ دینے میں نمایاں تعاون کے لیے ملک کے ہر ایک خطے میں نمایاں تعلیمی اداروں کو ہر سال ایک لاکھ روپے کے چار ایوارڈز دیے جائیں گے۔ **(قومی آواز، نئی دہلی)**

آل انڈیا مضمون نویسی مقابلہ

● نئی دہلی، 24 راگست۔ ''مدارسِ دینیہ کے خلاف پیدا ہوئے شکوک اور ان کے خلاف سوچی سمجھی سازشوں کی مدافعت، ردِ عمل کے بجائے انتہائی سمجھداری سے کرنی چاہیے۔ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر لوگوں تک یہ بات پہنچانی چاہیے کہ مدارس وطن سے محبت اور حسنِ اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں''۔ آج یہاں غالب اکادمی، نئی دہلی میں منعقد 'دہلی مدارس ایجوکیشن آرگنائزیشن' کے زیرِ اہتمام، قاضی مجاہد الاسلام قاسمی میموریل ایوارڈ آل انڈیا مضمون نویسی مقابلہ 2003 کے تقسیمِ انعامات کے پروگرام میں مولانا سید نظام الدین نے یہ بات کہی۔ پروگرام کی صدارت قاری زبیر احمد جامعی اور نظامت معین اختر انصاری نے انجام دی۔ افتتاحی خطبہ ڈاکٹر منظور عالم، استقبالیہ کلمات قاری عبدالغفار اور

تعارفی خطبہ مولانا افتخار حسین احمد نے دیا۔ حسن احمد چیئرمین ڈی.ایس.آئی. ڈی.بی. ،سعید الدین قاسمی، ڈاکٹر پرویز میاں، مولانا وارث مظہری، مولانا محمد مہدی القاسمی، مولانا مبین اختر قاسمی اور مولانا صابر عالم نے بھی حاضرین وطلبہ سے خطاب کیا۔ ایوارڈ مولانا سید نظام الدین کے ہاتھوں تقسیم کیے گئے۔ مضمون نویسی کے مقابلے میں ملکی سطح پر طلبہ و طالبات نے حصہ لیا۔ اوّل، دوم اور سوم پوزیشن بالترتیب محمد آصف الدین ندوی، ابرار احمد اور محمد ثاقب تنویر الطافی نے حاصل کیے جنھیں ایوارڈ، سند اور رقوم سے نوازا گیا۔ دیگر شاملِ مقابلہ طلبہ و طالبات کو اسناد پیش کیے گئے۔ **(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)**

اتر پردیش اردو رابطہ کمیٹی کی عوامی بیداری مہم

● فیض آباد، 10 راگست۔ ’’اردو کی بقا، ترویج وترقی اور اس کے مسائل کا حل تلاش کرنا محبانِ اردو کا ہی کام ہے۔ اگر وقت رہتے اس کی فکر نہ کی گئی تو حالات بد سے بدتر ہوجائیں گے۔ جولوگ اردو کی وکالت کرتے ہیں، ان میں سے بیشتر کے گھروں میں بچے اردو سے نابلد ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ ہم، آپ عہد کریں کہ اپنے اپنے محلّوں اور گھروں میں بچوں کو تمام تر عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو ضرور پڑھائیں گے‘‘۔ یہ باتیں اتر پردیش اردو رابطہ کمیٹی کے ریاستی صدر ڈاکٹر عرفی فیض آبادی نے علی گڑھ، خورجہ، غازی آباد، گجرولہ، مراد آباد اور شاہجہاں پور میں عوامی بیداری مہم کے سلسلے میں اردو رابطہ کمیٹی کی مقامی شاخوں کے زیر اہتمام ہونے والے جلسوں میں کہیں۔ انھوں نے مختلف جگہوں پر اردو میڈیم اسکول اور شبینہ اسکول کھولے جانے کی پُر زور وکالت کی۔ ڈاکٹر عرفی نے سیاسی جماعتوں سے شکوہ کیا کہ وہ صرف الیکشن کے وقت اس زبان کو شیروانی سمجھ کر پہن لیتے ہیں اور الیکشن کے بعد اتار کر اسے بھول جاتے ہیں۔ **(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)**

ہائی اسکول میں اردو کے دو پرچے بحال کرنے کا مطالبہ

● فیض آباد، 12 راگست۔ اردو رابطہ کمیٹی، اتر پردیش کی ایک میٹنگ ریاستی صدر ڈاکٹر عرفی فیض آبادی کی صدارت میں ہوئی جس میں بطور مہمان خصوصی ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے شرکت کی جبکہ ریاستی جنرل سکریٹری ڈاکٹر کلیم قیصر نے مختلف اضلاع میں اردو کے سلسلے میں کیے جانے والے کاموں کی تفصیل پیش کی۔ اس میٹنگ میں حکومت اور یوپی بورڈ، الہ آباد کے ذمّے داروں سے مطالبہ کیا گیا کہ ہائی اسکول میں 2001 تک ہونے والے امتحان کی طرح پھر سے اردو کے پرچے دو حصّوں میں تقسیم کردیے جائیں۔

گزشتہ برس دونوں پرچوں کو ملا کر ایک کردیا گیا جس سے اردو طلبہ پریشان ہیں۔ اس کے علاوہ ای پی ڈی ای پی اسکیم کے تحت اسکولوں کو مفت ملنے والی اردو کتب کو طلبہ تک پہنچانے اور بازار میں اردو کتابوں کی دستیابی کو یقینی بنانے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ اردو جاننے والوں کے لیے محلّہ محلّہ اور گاؤں گاؤں میں لائبریری کا قیام عمل میں لانے کی تجویز بھی رکھی گئی۔ اس میٹنگ میں ریاستی کمیٹی کے رکن حامد بہرائچی اور بارہ بنکی کے کنوینر ڈاکٹر رؤف صدیقی نے بھی شرکت کی۔ **(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)**

راجستھان میں اردو کو سرکاری زبان بنانے کا یو.ایم.آئی. کا مطالبہ

● جے پور۔ یو.ایم.آئی. کی نوتشکیل شدہ شاخ کی ایک میٹنگ حکیم ابراہیم خاں آڈیٹوریم راجپوتانہ یونانی میڈیکل کالج اینڈ ریسرچ سینٹر میں ہوئی۔ یہ میٹنگ ڈاکٹر غلام قطب چشتی کی صدارت میں ہوئی، مہمانِ خصوصی ڈاکٹر عطاء الرحمٰن تھے۔ اس میں مطالبہ کیا گیا کہ راجستھان میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ اس پر بھی زور دیا گیا کہ مسلمانوں میں تعلیم کا رجحان بڑھایا جائے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں پر فرقہ پرستوں کی جانب سے انگشت نمائی کی مذمت کی گئی اور اس سلسلے کو بند کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ یو.ایم.آئی. نے اپنی تنظیمی شاخ کو مضبوط بنانے پر بھی غور کیا اور سرکاری اسکیموں سے مسلمانوں کو بھی مستفیض کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ میٹنگ میں بڑی تعداد میں عہدیداران اور ممبران نے حصہ لیا۔ **(قومی آواز، نئی دہلی)**

راجستھان اردو اکادمی میں شامِ پریم چند

● جے پور، 8 راگست۔ راجستھان اردو اکادمی کے چیئرمین راہی شہابی نے آنجہانی منشی پریم چند کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ پریم چند نے غریب مزدوروں، کسانوں اور پسماندہ افراد کے مسائل کو پہلی بار اردو افسانے اور ناول کا موضوع بنایا۔ ان کی تحریروں نے ایک نئی تحریک کو جنم دیا۔ اردو دنیا ان کے اس کارنامے کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ راجستھان اردو اکادمی کی طرف سے منعقدہ ’’شامِ پریم چند‘‘ میں راجستھان ہندی اکادمی کے چیئرمین مسٹر وید ویاس، مشہور ہندی کوی ڈاکٹر تارا پرکاش، سابق ریڈیو ڈائرکٹر مشتاق احمد اور جلسے کے صدر جناب علاء الدین آزاد، چیئرمین راجستھان مدرسہ بورڈ کے علاوہ یونیورسٹی آف راجستھان، جے پور میں شعبۂ اردو کے سربراہ ڈاکٹر فیروز احمد نے بھی اپنے گرانقدر خیالات کا اظہار کیا۔ **(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)**

چوتھا شاہ ولی اللہ ایوارڈ

● نئی دہلی۔ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز، نئی دہلی کی جانب سے

اسلامی اقدار کے فروغ میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی خدمات جلیلہ کے اعتراف میں سماجیات، ادبیات، قانون اور اسلامیات کے میدانوں میں نمایاں کارنامے انجام دینے والے ممتاز دانشوروں کے اعزاز میں پہلا شاہ ولی اللہ ایوارڈ عالم اسلام کے معروف مفکر و مصنف حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو 'علوم اسلامی' پر ان کی وسیع اور گراں قدر خدمات کے اعتراف میں، دوسرا ایوارڈ شریعت اسلامی کے ماہر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کو 'فقہ اسلامی' پر اور تیسرا ایوارڈ اقتصادیات اسلامی کے ماہر پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقی کو 'اسلامی معاشیات' کے موضوع پر تفویض کیا گیا۔

چوتھا شاہ ولی اللہ ایوارڈ ''قرآنی علوم اور عصر حاضر'' کے موضوع پر مورخہ 20/دسمبر 2003 کو تفویض کیا جائے گا۔ ایوارڈ کے لیے موزوں و مستحق دانشور کے نام کی تجویز کے لیے ادارہ ملتمس ہے۔ مجوزہ نام موصول ہونے کی آخری تاریخ 15/اکتوبر 2003 مقرر کی گئی ہے۔

مزید برآں اسلامی فکر رکھنے والے 45 سال سے کم عمر کے صاحب علم وقلم حضرات کی حوصلہ افزائی کے لیے ہر سال معینہ عنوان پر سب سے عمدہ مقالہ لکھنے والے اسکالر کو مبلغ پچیس ہزار (25000) روپے کا نقد انعام مختص کیا گیا ہے۔ مقالے کا عنوان ''شاہ ولی اللہ کی قرآنی فکر'' طے کیا گیا ہے اور مقالہ موصول ہونے کی آخری تاریخ 30/اکتوبر 2003 ہے۔ معینہ فارم و دیگر تفصیلات کے لیے درج ذیل پتے پر رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

پروگرام آفیسر
انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز،
پوسٹ بکس نمبر: 162,9725، جوگا بائی، مین روڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی-25
فون نمبر: 26981187, 26989253, 26987467
Website : www.iosworld.org

(ڈاک سے)

مولانا انظر شاہ کشمیری کو ''راشٹرپتی ایوارڈ''

● دیوبند، 23/اگست۔ حکومت ہند نے عربی زبان کے فروغ کے لیے دارالعلوم (وقف) دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا انظر شاہ کشمیری کی نصف صدی پر محیط خدمات کے اعتراف میں ان کو ''راشٹرپتی ایوارڈ'' دینے کا اہم فیصلہ کیا ہے۔ اس کی اطلاع مولانا کشمیری کو مرکزی حکومت کے شعبۂ لسان کے ڈپٹی سکریٹری مسٹر ایس کے ترپاٹھی نے ایک مراسلے کے ذریعے دی۔ مولانا انظر شاہ کشمیری ایک عالمی شہرت یافتہ عالم دین ہیں۔ گذشتہ پچاس برسوں سے زائد عرصے میں انھوں نے 28 سال تک دارالعلوم دیوبند میں اور گذشتہ 23 سال سے وقف دارالعلوم دیوبند میں اہم منصبوں پر رہ کر علوم دینیہ کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر 15 کتابیں لکھی ہیں، جن میں پانچ تفسیری کتابوں کا عربی سے اردو میں ترجمہ شامل ہے۔ لسانی خدمات کے اعتراف میں حکومت سے راشٹرپتی ایوارڈ پانے والے مولانا انظر شاہ پہلے دیوبندی عالم ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

عابد رضا بیدار کا اردو گھر، الٰہ آباد میں استقبال

● الٰہ آباد، 22/اگست۔ خدابخش لائبریری کے سابق ڈائرکٹر اور معروف محقق جناب عابد رضا بیدار کی الٰہ آباد آمد پر زبان وتہذیب کے ادبی اور ثقافتی مرکز ''اردو گھر'' میں استقبالیہ پیش کیا گیا اور اس کے بعد ان کے اعزاز میں شعری نشست منعقد ہوئی جس میں شہر کے معروف نمائندہ شعرا نے حصہ لیا۔ جلسے کی صدارت پروفیسر سید محمد عقیل رضوی، سابق صدر شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی اور نظامت ڈاکٹر علی احمد فاطمی ریڈر شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی نے فرمائی۔ ڈاکٹر فاطمی نے بیدار صاحب کی گرانقدر خدمات پر روشنی ڈالی۔ بیدار صاحب نے اردو کے اراکین کو اردو گھر قائم کرنے پر مبارکباد دی اور نیک مشوروں سے نوازا۔ انھوں نے بحیثیت ڈائرکٹر خدابخش لائبریری اپنے تجربات اور کارناموں پر روشنی ڈالی اور فرمایا کہ درسی کتابوں سے منافرت کا زہر ہٹانا چاہیے اور ایسی کتابوں کی اشاعت پر زور دینا چاہیے جس سے مختلف فرقوں میں میل ملاپ پیدا ہو اور ایک دوسرے کے مذہب کو سمجھنے میں مدد ملے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی تعلیم کے لیے فارسی کی ابتدائی تعلیم بہت ضروری ہے، اس سے قدروں سے رشتہ جوڑنے میں آسانی ہوگی۔ صدر جلسہ پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے بیدار صاحب کی خوش اخلاقی اور توسیع علم میں دلچسپی اور فراخدلی کا تفصیل سے ذکر کیا۔ محمد عبدالقدیر ایڈووکیٹ نے اردو گھر اور شہر کے شعرا و ادبا کی طرف سے مہمان ذی وقار کا استقبال کیا اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ بعد ازاں ایک شعری نشست منعقد ہوئی۔ جس میں شعرا کرام نے اپنے اپنے اشعار پیش کیے۔ (سیاست جدید، کانپور)

ساحر شیوی کے اعزاز میں نشست

● 26/اگست۔ ممبئی۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی اور گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور چیئر برائے تقابلی مطالعہ، ممبئی یونیورسٹی کے زیر اہتمام ممتاز شاعر ساحر شیوی کے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام کیا گیا۔ جس کی صدارت علی ایم شمسی نے فرمائی۔ ڈاکٹر یونس اگاسکر نے مہمان خصوصی ساحر شیوی کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ وہ دنیا کے مختلف شہروں میں رہے، مگر اپنے وطن کی مٹی اور اپنی زبان سے ان کی محبت کم نہ ہوئی، ان کی شاعری میں اس محبت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے افسانے اور دیگر اصناف میں بھی اپنی تخلیقی

صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ بعد ازاں مہمان ساحر شیوی نے اپنے کلام سے حاضرین کو نوازا۔

جناب یوسف ناظم نے مختصراً ساحر شیوی سے اپنے تعلقات اور ان کی شخصیت پر اظہارِ خیال کیا اور ان کے ہندی افسانوی مجموعے 'کیچ برڈ' کی رونمائی فرمائی۔ علی ایم شمسی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ساحر شیوی اردو کے بے لوث اور مخلص شیدائی ہیں اور زبان کی خدمت میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں۔ ایگزیکٹیو افسر وقار قادری نے اس تقریب کی نظامت کے فرائض انجام دیے اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

شعروافسانہ کی محفلیں

● علی گڑھ، 17 راگست۔ جشنِ آزادی کے موقعے پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیرِ اہتمام وائس چانسلر جناب نسیم احمد کی صدارت میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس میں مقامی شاعروں کے علاوہ بیرونی اور مہمان شعرا میں مشہور شاعر ندا فاضلی، ہماچل پردیش کے بزرگ شاعر کرشن کمار طور، پروفیسر فضل امام رضوی اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر شاہد ماہلی نے بطورِ خاص شرکت کی۔ اس موقعے پر شعبۂ اردو کی سربراہ پروفیسر قیصر جہاں نے کہا کہ شعروادب کی یہ محفلیں عوام کے دلوں کو جوڑنے اور نفرتوں کو دور کرنے میں اہم رول ادا کر رہی ہیں۔ اپنے صدارتی کلمات میں جناب نسیم احمد نے کہا کہ تحریکِ آزادی کو پروان چڑھانے میں اردو زبان و ادب نے جو رول ادا کیا ہے وہ ہندستان کی شاید ہی کسی دوسری زبان نے ادا کیا ہو۔ انقلاب زندہ باد کا نعرہ سب سے پہلے اردو والوں نے لگایا۔

پروفیسر محمد زاہد نے نظامت کے فرائض انجام دیے جبکہ آرٹس فیکلٹی کی ڈین پروفیسر ناہید صفوی آذرمیدخت نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ پروفیسر صفوی نے کہا کہ آج فکر کی آزادی، زبان کی آزادی اور ادب کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ ادب نے فکر کو اور سماج کو بہت کچھ دیا ہے۔ اس مشاعرے میں راشد انور، راحت حسن، عابد علی عابد، سراج اجملی، مہتاب حیدر نقوی، کرشن کمار طور، فضل امام رضوی، شاہد ماہلی، ندا فاضلی، معراج رضا، اقبال حسین صدیقی، منظور ہاشمی اور نعمت اللہ شیروانی نے اپنے کلام سے نوازا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی، 15 راگست۔ اردو اکادمی دہلی کی جانب سے سپرو ہاؤس میں مشاعرہ جشنِ آزادی منعقد کیا گیا جس کی صدارت وزیرِ خوراک و رسد ہارون یوسف نے کی، جب کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر سید شاہد مہدی بطور مہمانِ خصوصی شریک ہوئے۔ شاعروں میں ساغر اعظمی، وسیم بریلوی، منصور عثمانی، ساغر خیامی، قیس رامپوری، نسیم نکہت، حیات لکھنوی، گلزار دہلوی، بشیر نواز، شفیع ساغر، اقبال اشہر، راہی شہابی، شین۔ کاف۔ نظام، ملکہ نسیم، نور جہاں ثروت، جاوید عرشی اور چندر بھان خیال نے شرکت کی اور اپنے اشعار سے سامعین کو محظوظ کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی، 22 راگست۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اکیڈمک اسٹاف کالج کے زیرِ اہتمام پروفیسر صغریٰ مہدی کی صدارت میں ایک شامِ افسانہ کا انعقاد کیا گیا جس میں اقبال مہدی، ذکیہ ظفر، ترنم ریاض، شمع افروز زیدی، نگار عظیم، ابنِ کنول، ریفریشر کورس میں شریک ثروت النسا اور احمد حسن دانش نے اپنی کہانیاں سنائیں۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے اس شامِ افسانہ میں شرکت کی۔ اخیر میں پروفیسر صغریٰ مہدی نے بھی اپنی کہانی پیش کی۔ بعد ازاں ملک کی مختلف یونیورسٹیوں سے آنے والے ریفریشر کورس کے پچاس سے بھی زائد شرکا نے تبادلۂ خیال کیا۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے شامِ افسانہ میں پڑھی گئی کہانیوں پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے انھیں موجودہ عہد کی نمائندہ کہانیوں سے تعبیر کیا۔ ڈائرکٹر اکیڈمک اسٹاف کالج ڈاکٹر اختر صدیقی نے فنکاروں اور شرکائے محفل کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں ناظمِ نشست اور ریفریشر کورس کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر خالد محمود نے شامِ افسانہ کی کامیابی پر تمام افسانہ نگاروں، مہمانِ خصوصی اور ملک کی تمام ریاستوں سے آئے ہوئے یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ کا شکریہ ادا کیا۔
(قومی آواز، نئی دہلی)

● جموں۔ اردو اور ہندی کے معروف کہانی کار مرحوم منشی پریم چند کی یاد میں گذشتہ روز ریاست کی نامور سب رنگ ادبی تنظیم' ادبی کنج' جموں کے زیرِ اہتمام ''سب رنگ ادبی محفلِ افسانہ'' کا انعقاد ہوا جس میں مختلف زبانوں کے ادبا و شعرا نے بڑی تعداد میں حصہ لیا جس کی صدارت معروف صحافی سردار کرپال سنگھ کسالی نے کی۔ معروف ہندی طنز نگار ڈاکٹر بھارت بھوشن اس ادبی محفل کے مہمانِ خصوصی تھے اور نظامت کے فرائض ادبی کنج جموں کے سکریٹری شری طالب کشمیری نے انجام دیے۔ اپنے استقبالیہ خطبے میں شام طالب صدر ادبی کنج جموں نے اس نشست کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج ہم افسانوی دنیا کے جادوگر، جدید افسانہ نگاری کے علمبردار منشی پریم چند کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے اس محفلِ افسانہ کا انعقاد کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ادبی کنج جموں کی نائب صدر محترمہ نرگس ستارہ نے اپنا مقالہ ''منشی پریم چند اور موجودہ نثر نگار — میری نظر میں'' پیش کیا۔ منشی پریم چند کی شخصیت پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے والوں میں کرپال سنگھ کسالی، ڈاکٹر بھارت بھوشن، ڈاکٹر اوم ودیارتھی اور طالب کشمیری بھی شامل تھے۔ اس محفل میں شری او۔ پی۔ شاکر، شری شام طالب، شری چندر وید پرکاش اور شری طالب کشمیری نے اپنے افسانے پیش کیے۔ (تسکین، جموں)

رسمِ اجرا

دیوانِ غالب سنسکرت میں

● الہ آباد۔ 5/اگست۔ اردو کے مشہور شاعر مرزا غالب کے دیوان کا سنسکرت ترجمہ منظرِ عام پر آگیا ہے۔ یہ ترجمہ سنسکرت، اردو اور فارسی کے ممتاز اسکالر شری جگن ناتھ پاٹھک نے کیا ہے جس کی رسمِ اجرا گذشتہ دنوں مرکزی وزیر برائے وزارتِ ترقی انسانی وسائل ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی نے انجام دی۔
(قومی آواز، نئی دہلی)

''اساسِ حیات''

● مراد آباد۔ 18/جولائی 2003 کو مقامی ایچ ایس بی انٹر کالج میں شہرِ جگر کے بزرگ شاعر جناب انعام الحق حیرت مراد آبادی کے مجموعۂ کلام ''اساسِ حیات'' کا اجرا اتر پردیش اردو اکادمی کے چیئرمین جناب اعظم قریشی کے دستِ مبارک سے عمل میں آیا۔ اس تقریب میں ڈاکٹر محمد الیاس، جناب این این تیواری، جناب ایس کے سکسینہ سوریہ، جناب مظفر سلطان حسن اور ڈاکٹر توصیف الحسن نے مقالات پڑھے۔ پروگرام کی صدارت مشہور صنعت کار جناب اجے گپتا نے کی اور نظامت کے فرائض جناب جاوید رشید عامر نے انجام دیے۔ پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر توصیف الحسن اور کشور عثمانی تھے۔ پروگرام میں کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی، جن میں شعرا، ادبا، اساتذہ، محبانِ اردو، صحافی اور دیگر حضرات شامل ہیں۔ (ڈاک سے)

خیابانِ خاطر

● گلبرگہ۔ ممتاز شاعر جناب عبدالستار خاطر کے اولین شعری مجموعے ''خیابانِ خاطر'' کا رسمِ اجرا بزمِ امانِ اردو، گلبرگہ کے زیرِ اہتمام جناب قمرالاسلام، وزیرِ صحت حکومتِ کرناٹک کے دستِ مبارک سے ہوا۔ جناب قمرالاسلام نے بزمِ امانِ اردو کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ یہ بزم گذشتہ ڈیڑھ سال سے گلبرگہ میں نمایاں حیثیت سے سامنے آئی ہے۔ جناب منظور احمد، کوثر پروین اور ڈاکٹر وحید انجم خاص طور سے مبصرین میں تھے۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر جلیل تنویر شعبۂ اردو گورنمنٹ ڈگری کالج نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ خاطر صاحب کا رجحان غزل کی طرف زیادہ ہے۔ مہمانانِ خصوصی جناب حمید سہروردی صدر شعبۂ اردو و فارسی، جامعہ گلبرگہ اور سید مجیب الرحمان، ڈاکٹر شمیم ثریا پرنسپل بی بی رضا ڈگری کالج، گلبرگہ وغیرہ نے جلسے کو خطاب کیا۔ اس جلسے کی نظامت کے فرائض قاضی شکیل الدین، خازن بزم نے کی۔ آخر میں حافظ شکیل احمد کے اظہارِ تشکر پر جلسہ ختم ہوا۔ (ڈاک سے)

فقہ کوئز

● حیدرآباد۔ خلیل احمد ندوی کی کتاب ''فقہ کوئز'' کا اجرا بدستِ پروفیسر محمد عبدالمجید ہائی اسکول عثمان باغ بہادر پورہ میں منعقد جلسے میں ہوا۔ پروفیسر محمد عبدالمجید نے اس موقعے پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ عملی زندگی میں کامیابی کے لیے قابلیت اور صلاحیت ضروری ہے اور یہ محنت سے آتی ہے۔ ڈاکٹر لئیق احمد صدیقی، سپر وائزر صمدانی کمپیوٹرائزڈ کیلی گرافی سینٹر زیرِ اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے کہا کہ اس کتاب کو جس اہلِ علم نے بھی دیکھا، پسند کیا۔ جناب احمد محی الدین فیکلٹی کمپیوٹر سینٹر نے کتاب کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس کتاب کو ہر گھر میں ہونا چاہیے۔ جناب توفیق احمد صدیقی فیکلٹی کے شکریے پر سمینار اختتام کو پہنچا۔ (ڈاک سے)

سرورِ جاوداں

● پونہ، 6/جولائی۔ پونہ کالج ہال میں منظور الحسن منظور کی کتاب ''سرورِ جاوداں'' کا اجرا عمل میں آیا جس میں جسٹس شفیع پرکار بطور مہمانِ خصوصی ممبئی سے تشریف لائے۔ قبیلہ علم و ادب کے سرخیل ڈاکٹر امانت صدرِ جلسہ تھے۔ مشہور افسانہ نگار قاضی مشتاق احمد اور حسن عباس فطرت نے اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور سحر جلگانوی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ منظور الحسن نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں نے یہ کام بحرِ عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر کیا، ورنہ اس سے قبل میرا دماغ سادہ ورق بنا ہوا تھا۔ پرکار صاحب نے کہا کہ ''سرورِ جاوداں'' میں حج کے روحانی پہلو کی دلکش جھلکیاں دکھائی گئی ہیں۔ قاضی مشتاق صاحب نے کہا کہ اگر اردو کتابوں کے قاری نہیں ہیں تو اس کی ذمے داری مصنفین پر ہے۔
(ڈاک سے)

ارضِ مقدس فلسطین

● اورنگ آباد، 25/جولائی۔ بزمِ فروغِ ادب کے زیرِ اہتمام سید اطہر کی کتاب ''ارضِ مقدس فلسطین'' کی رسمِ اجرا نہرو بھون میں بدست ڈاکٹر خلیل الدین انجام پائی۔ مولانا ابوظفر حسان ندوی نے صدارت فرمائی۔ اس تقریب میں اورنگ آباد، ممبئی، پربھنی، جالنہ اور عثمان آباد وغیرہ سے ممتاز ماہرینِ تعلیم، علمائے کرام، دانشور، شعرا، ادبا، اساتذہ، طلبہ اور باذوق خواتین و حضرات کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔ عبدالقدیر خاں سیفی صدرِ بزم نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں بزم کی کارکردگی صدرِ جلسہ و مہمانانِ خصوصی کا تعارف اور مصنف کی تعلیمی و ادبی خدمات کے علاوہ کتاب کی فنی خوبیوں اور ارضِ مقدس کی اہمیت کا تذکرہ

کیا۔ مقررین میں ڈاکٹر مظہر محی الدین، ڈاکٹر صدرالحسن ندوی مدنی، ڈاکٹر دوست محمد خاں، اشفاق سلامی اور خواجہ معین الدین کے نام قابل ذکر ہیں۔ صدر بزم کے شکریے پر جلسہ اختتام پذیر ہوا۔ (ڈاک سے)

جانے والوں کی یاد

پروفیسر علی محمد خسرو

● نئی دہلی، 25 اگست۔ عالمی شہرت کے مالک ماہر اقتصادیات، سفارت کار اور اے.ایم.یو کے سابق وائس چانسلر پروفیسر علی محمد خسرو کو بستی حضرت نظام الدین کے نزدیک قبرستان باغ خسرو میں سپرد خاک کردیا گیا، ان کا کل رات انتقال ہوگیا تھا۔ 7 اگست کو انھیں دل کا دورہ پڑا تھا، اس کے بعد انھیں اسپتال میں داخل کیا گیا تھا، ان کی عمر تقریباً 78 سال تھی۔ پسماندگان میں ایک بیٹا اور بیٹی ہیں۔

ان کی تدفین میں کئی سرکردہ شخصیتیں شامل تھیں جن کا تعلق تعلیمی اور انتظامی شعبوں سے تھا۔ ان میں سابق مرکزی وزیر اور کئی ریاستوں میں گورنر رہے، جناب خورشید عالم خاں، سابق گورنر بہار اور راجیہ سبھا رکن جناب اخلاق الرحمان قدوائی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب شاہد مہدی، جامعہ ہمدرد کے چانسلر جناب سید حامد، جناب سید شہاب الدین، جناب خواجہ حسن ثانی نظامی، جناب منموہن سنگھ، جناب حامد انصاری اور انڈین ایکسپریس کے جناب شیکھر گپتا شامل ہیں۔ ان کے علاوہ مداحوں اور شاگردوں کی بہت بڑی تعداد ان کی تدفین کے وقت موجود تھی۔

پروفیسر خسرو ہندستان کے ان چند مسلمانوں میں شامل تھے جنھوں نے قومی سطح پر اپنی اہمیت ثابت کی۔ انھوں نے تعلیمی، انتظامی اور سفارتی ہر شعبے میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑے۔ انھیں گیارھویں مالیاتی کمیشن کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔ وہ منصوبہ بندی کمیشن کے رکن، ''فنانشیل ایکسپریس'' کے مدیر، جرمنی میں ہندستان کے سفیر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر، ریزرو بینک کے ڈائرکٹر اور آغا خاں انسٹی ٹیوٹ کے چیئرمین سمیت متعدد اعلا عہدوں پر فائز رہے۔ ان کے انتقال پر ملک کی سرکردہ شخصیتوں نے اظہار تعزیت کیا ہے۔

(قومی آواز، نئی دہلی)

ڈاکٹر قمرالدین

دہلی۔ مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر قمرالدین مورخہ 24 اگست کو اس دارفانی سے کوچ کرگئے۔ ڈاکٹر قمرالدین کی زندگی تعلیم و تعلم سے عبارت تھی۔ NCERT سے بحیثیت ریڈر سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے اپنی خدمات ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، دہلی کو پیش کردی تھیں جس سے وہ تادم حیات وابستہ رہے۔ اقلیتوں کی تعلیم، دینی تعلیم، مدرسہ کی تعلیم، امتحانات، تاریخ اور صوفی ازم ان کے مطالعے کے خاص موضوعات تھے۔

ان کا ایک اہم کارنامہ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، دہلی کے تحت ہندستان کی دینی درسگاہوں کا کل ہند سروے ہے۔ 1996 میں یہ پہلی بار کتابی صورت میں شائع ہوا۔ فی الحال وہ مدارس کی ایک کل ہند جامع فہرست، اردو میڈیم اسکولوں کی ڈائرکٹری، مسلمانوں کے زیر انتظام چلنے والے اسکولوں اور کالجوں کی فہرست اور کمزور طبقات کے لیے کام کرنے والی رضاکار تنظیموں کی ڈائرکٹری تیار کرنے کے کام میں مصروف تھے۔ گیارہ کتابوں، 100 سے زیادہ تحقیقی مقالوں، تاریخ کی دو کتابوں کا ترجمہ اور بیشتر تعلیمی کام ان کی یادگار ہیں۔

مدارس دینیہ کے احوال و مسائل، ان کی ترقی و استحکام، ان کے اساتذہ کی ٹریننگ اور مدارس کے نصاب تعلیم میں عصری آگہی کی شمولیت وغیرہ امور سے ان کی دلچسپی آخر وقت تک قائم رہی اور ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کے سکریٹری جناب سید حامد کی قیادت میں وہ ان منصوبوں کو روبہ عمل لاتے رہے۔ ان کی وفات کو محمد اشفاق احمد سکریٹری تعلیم، جماعت اسلامی ہند نے تعلیمی دنیا کے لیے ایک زبردست نقصان قرار دیتے ہوئے ان کے لیے مغفرت اور پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی۔ (ڈاک سے)

محسن زیدی

● لکھنؤ، 4 ستمبر۔ اردو کے ممتاز شاعر جناب محسن زیدی کا آج صبح ساڑھے چار بجے طویل علالت کے بعد ان کی رہائش گاہ واقع اندرانگر میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 68 برس تھی۔ وہ گذشتہ دو ماہ سے کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ مرحوم کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹے ہیں۔ وہ 1935 میں ضلع بہرائچ میں پیدا ہوئے تھے۔ محسن زیدی کے شعری سفر کا آغاز 1950 میں ہوا۔ ان کی غزلیں کلاسیکی رچاؤ سے آراستہ ہیں۔ ان کے شعری مجموعوں میں شہر دل (1961)، رشتۂ کلام (1978)، متاع آخر شب (1990) اور باب سخن (2000) شامل ہیں۔ مرحوم 1993 میں جوائنٹ سکریٹری، حکومت ہند کی حیثیت سے ریٹائر ہونے کے بعد دہلی سے لکھنؤ منتقل ہوگئے تھے۔

ادبی حلقوں نے محسن زیدی کے انتقال کو ادب کا ایک بڑا نقصان قرار دیا ہے۔ انھوں نے بحیثیت شاعر روایت سے استفادہ کرتے ہوئے جدید رجحانات

کی پیروی کی۔ وہ پہلے ایسے شاعر تھے جنھوں نے غزل میں کربلا کو بحیثیت استعارہ اور علامت استعمال کیا، بعد میں اس کی پیروی ہند و پاک کے دوسرے شعرا کی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

طاہر تلہری

● نئی دہلی، 4/اگست۔ ادبیات عالیہ اکادمی، نئی دہلی کے زیر اہتمام ممتاز شاعر طاہر تلہری کے انتقال پر ایک تعزیتی جلسہ زیرِ صدارت علامہ ابوالمجاہد زاہد منعقد ہوا۔ صدرِ جلسہ نے کہا کہ طاہر تلہری کی موت، ایک شاعر یا ادیب کی نہیں بلکہ ایک ادارے کی موت ہے جس سے نہ جانے کتنے تشنگانِ شعر و فن نے فیض اٹھایا ہے۔ ڈاکٹر تابش مہدی نے طاہر تلہری کے ساتھ اپنی تین دہائیوں کی رفاقت اور ان کی طویل شعری، ادبی اور عروضی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ طاہر تلہری کو میں نے سفر و حضر میں دیکھا، پرکھا اور پہچانا ہے، وہ ہمیشہ کھرے ملے۔ وہ جتنی اچھی شاعری کرتے تھے، اتنی ہی اچھی نثر بھی لکھتے تھے۔ ان کے انشائیے اگر مرتب کیے جائیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر توقیر احمد خاں، ڈاکٹر جلال انجم، ماجد دیوبندی، ابرار کرت پوری، سید منور حسن کمال اور عمیر منظر نے بھی طاہر تلہری کی ہمہ پہلو شخصیت پر اظہار خیال کیا۔ ادبیات عالیہ اکادمی کے سکریٹری خالد ولایت عمری نے طاہر تلہری کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''پہلا پتھر'' 1974 میں منظرِ عام پر آیا، دوسرا ''الکلام'' 1986 میں، تیسرا ''حرف بے لباس'' 1996 میں اور چوتھا مجموعہ ''پتھر کو موم کیا ہے'' ترتیب و تدوین کی منزل سے گزر کر زیرِ کتابت ہے۔ تنویر آفاقی نے طاہر تلہری کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

مولوی وجاہت اللہ خاں

● رامپور۔ ممتاز صحافی اور مصنف مولوی وجاہت اللہ خاں وجیہی کا مورخہ 28/جولائی 2003 کو ایک سڑک حادثے میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم 4/جنوری 1953 کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی نصرت اللہ خاں تھے۔ انھوں نے عربی و فارسی بورڈ، الٰہ آباد سے عالمیت کی سند حاصل کی، بعد ازاں جدید علوم بھی حاصل کیے۔ 1975 میں وہ مدرسہ جامع العلوم فرقانیہ کی لائبریری میں بحیثیت لائبریرین مقرر ہوئے۔ مرحوم کو اسلامیات اور تاریخ اسلام سے خصوصی شغف تھا۔ انھوں نے اپنے نانا مولانا وجیہ الدین احمد خاں وجیہ کی فنِ تصوف پر کتاب ''فیوضاتِ وزیریہ'' کو ترتیب دے کر 1982 میں شائع کیا۔ 1998 میں انھوں نے حضرت وجیہ کی دوسری تصنیف ''مسلکِ اربابِ حق'' پر قابلِ قدر طویل حواشی لکھ کر اسے شائع کیا۔ مرحوم اکتوبر 1991 سے ''ماہنامہ ضیاء وجیہ'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور آخری اداریہ اگست 2003 کے شمارے کے لیے لکھا۔ ان کی آخری تالیف خطیبِ اعظم مولانا وجیہ الدین احمد خاں وجیہ (1899-1987) کی سوانح ہے، جو زیرِ طباعت ہے۔ (ڈاک سے)

خمار قریشی اور رشید شکیب کو خراج عقیدت

● گلبرگہ، 10 اگست۔ خمار قریشی نئے لہجے کے ممتاز شاعر تھے۔ مرحوم روزنامہ ''سلامتی'' اور سلامتی لٹریری اینڈ کلچرل فورم گلبرگہ سے وابستہ رہے۔ انھوں نے ایک ادبی جریدے کی ادارت بھی کی۔'' ان خیالات کا اظہار محمد عبدالعظیم (صدر) نے انجمن ترقی اردو گلبرگہ کی مجلس عاملہ کے تعزیتی اجلاس میں کیا۔ انھوں نے رشید شکیب کی ادبی خدمات کو بھی خراج عقیدت پیش کیا۔ جناب وہاب عندلیب (صدر، کرناٹک اردو اکادمی) نے اپنے اظہارِ خیال میں رشید شکیب مرحوم سے اپنے شخصی روابط کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ رشید شکیب کراچی میں رہتے ہوئے بھی گلبرگہ کے فنکاروں کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ انھیں دکنی اور دکن کے کلچر سے بڑی انسیت تھی۔ جناب خمار قریشی (مرحوم) کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے جناب وہاب عندلیب نے کہا کہ جدیدیت کے تحت ابھرنے والے شاعروں میں خمار قریشی کو اسلوب اور لہجے کی وجہ سے امتیاز حاصل تھا۔ اپنی خودشناسی اور خوداعتمادی کے ذریعے وہ ترقی کے زینے طے کرتے رہے۔ ڈاکٹر جلیل تنویر (نائب صدر) نے فرزند گلبرگہ رشید شکیب کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ مرحوم سے شخصی طور پر واقف تھے۔ انھوں نے کہا کہ خمار قریشی جیسے باکمال شاعر کی جس طرح پذیرائی ہونی چاہیے تھی نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر ناصر بن علی نے کہا کہ خمار قریشی اگرچہ کافی دنوں سے علیل تھے، اس کے باوجود ان کی شاعری ترقی کے منازل طے کرتی رہی۔ جناب حمید سہروردی (نائب صدر) نے کہا کہ رشید شکیب ایک ایسے فنکار تھے جو دیارِ غیر میں بھی وطن کے اثاثے کو تلاش کرتے رہے۔ انھوں نے خمار قریشی کے بارے میں کہا کہ انھوں نے ایک غزل گو کی حیثیت سے اپنی پہچان بنائی۔ جناب امجد جاوید نے کہا کہ خمار قریشی کی شاعری میں جدید اور کلاسیکل شاعری کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ڈاکٹر حشمت نے خمار قریشی سے اپنی ملاقاتوں کی یاد تازہ کی اور کہا کہ جدید شاعری میں خمار صاحب کا بڑا کنٹری بیوشن ہے۔ آخر میں مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔
(ڈاک سے)

□□□

تبصرہ وتعارف

پھولبن (دوسرا ایڈیشن) / ابن نشاطی

صفحات: 200، قیمت: -/52 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر.کے. پورم، نئی دہلی

مبصر: مخمور سعیدی

دکن میں اردو زبان کی بنیاد بہمنی سلطنت کے آخری زمانے میں پڑ چکی تھی اور قطب شاہی اور عادل شاہی عہد میں اس زبان نے اتنی ترقی کرلی تھی کہ یہ نہ صرف عام بول چال میں استعمال ہونے لگی تھی بلکہ اس میں تصنیفی کام بھی ہونے لگا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عوامی مقبولیت کے ساتھ ساتھ اسے عادل شاہی اور قطب شاہی حکمرانوں کی سرپرستی بھی حاصل ہوگئی تھی۔ فارسی اور عربی اس دور کی مقتدر زبانیں تھیں لیکن یہ نئی زبان مقامی زبانوں کے اثرات بھی قبول کررہی تھی اور اس کا مشترک ذخیرۂ الفاظ ہی اس کی سب سے بڑی طاقت تھی۔

ابن نشاطی کا زمانہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ ہے۔ اس وقت تک شعرا کے تذکرے لکھنے کا رواج نہیں ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ''پھولبن'' کی اس شہرت ومقبولیت کے باوجود جو اسے ابن نشاطی کی زندگی ہی میں حاصل ہوگئی تھی، ابن نشاطی کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات ہمارے پاس نہیں ہیں۔ اس کا ذکر سب سے پہلے غالباً گارساں دتاسی نے ''تاریخ زبان وادب ہندستانی وہندی'' (جلد اول، صفحہ 256) میں کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ وہ شیعہ تھا (یہ درست نہیں ہے کیونکہ دوسرے شواہد سے اس کی تردید ہوتی ہے) اور کئی کتابوں کا مصنف۔ اس نے اس کی کتابوں کے نام بھی لکھے ہیں۔ حالیہ زمانے کی کئی کتابوں میں ابن نشاطی کا ذکر ہے مگر یہ ذکر بھی سرسری ہے۔ سید محی الدین قادری زور نے مثنوی کے اشعار سے بعض شہادتیں فراہم کی ہیں اور لکھا ہے کہ ابن نشاطی ابتدا میں نثر نویس تھا، شاعری کی طرف اس نے بعد میں توجہ کی اور اس کی شعری تصنیف ''پھولبن'' ہی خواص اور عوام میں اس کی شہرت اور مقبولیت کا سبب بنی لیکن وہ خود اپنی شاعری سے زیادہ اپنی انشاپردازی پر ہی نازاں تھا اور اس طرف اس نے مثنوی میں بھی اشارہ کیا ہے ۔

اہے انشا پو میرا میل دائم
طبیعت کو مری ہے خط ملائم

''پھولبن'' کا سالِ تصنیف 1076ھ ہے۔ اس وقت تک اس عہد کے کئی اہم شعرا جیسے وجہی، غواصی اور نصرتی زندہ تھے اور ان کے شعری کارناموں کی دھوم تھی۔ ''پھولبن'' کی شعری خوبیوں کا کچھ اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ ان کارناموں کی موجودگی میں اس نے امتیاز حاصل کیا۔

''پھولبن'' کسی ایک قصے پر مبنی نہیں ہے، اس میں کئی قصے بیان ہوئے ہیں۔ جہاں ایک قصہ ختم ہوتا ہے، وہاں سے دوسرا قصہ اس طرح شروع ہوجاتا ہے کہ تسلسل ٹوٹنے نہیں پاتا۔ یہ وہی انداز ہے جو ''الف لیلہ'' یا بعض دوسری داستانوں میں نظر آتا ہے۔ ''پھولبن'' کا بنیادی قصہ کنچن پٹن کے بادشاہ کا ہے جو ایک درویش کو خواب میں دیکھ کر اسے اپنے پاس بلواتا ہے اور پھر وہ درج ذیل تین قصے بادشاہ کو سناتا ہے:

کشمیر کے بادشاہ کے باغ کے گل وبلبل کا قصہ جس میں ختن کے سوداگر زادے اور گجرات کے عابد کی بیٹی کا قصہ بھی شامل ہے۔

سوداگر کے بیٹے کی زبانی کسی بادشاہ کے دربار میں چینی نقاش کے وارد ہونے کا ذکر اور اس کے وزیر کی طرف سے اس کا دل بہلانے کے لیے نقلِ روح کا افسانوی بیان۔

اسی بادشاہ کے سامنے اس کا دوسرا وزیر کمن برا اور ہمایوں فال کی داستانِ محبت بیان کرتا ہے۔ سلسلۂ قصص کا آغاز زاہد کے الفاظ میں اس طرح ہوتا ہے کہ ''معرفت کی حقیقت ہر شخص نہیں سمجھ سکتا، اس لیے حقیقت کو کیوں نہ مجاز کے پیرائے میں بیان کیا جائے۔'' لیکن جو قصے بیان ہوئے ہیں اُن میں اخلاقی معنویت کم کم ہی اپنی موجودگی کا احساس کراتی ہے، زور قاری کی دلچسپی برقرار رکھنے یا پھر اپنے شاعرانہ کمال کے اظہار پر ہے۔ بیچ بیچ میں نصیحتیں بھی آگئی ہیں اور آدابِ حکمرانی کا بیان بھی لیکن مثنوی کی اصل خوبی اس کی سلاست، روانی اور محاکات آفرینی میں ہے۔ ابن نشاطی کی زبان ایسی ہے کہ دکنی سے معمولی واقفیت رکھنے والا بھی اسے سمجھ سکتا ہے اور اشعار جن شاعرانہ اوصاف سے متصف ہیں ان سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔

مثنوی کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر نئے عنوان کے ساتھ ایک ایک شعر درج ہے جو بحرِ ہزج میں ہے۔ یہ تمام اشعار جن کی تعداد 79 ہے ایک ہی بحر میں ہونے کے ساتھ ساتھ ہم قافیہ بھی ہیں۔ قوافی ہیں ''زندانی، حیرانی، پیشانی'' وغیرہ وغیرہ۔

''پھولبن'' کی مقبولیت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وقتاً فوقتاً اس کے قلمی نسخے تیار ہوتے اور اس کے قدرشناسوں کے ہاتھوں تک پہنچتے رہے۔ 1937 میں یہ کتاب پہلی بار مجلسِ اشاعتِ دکنی مخطوطات کی طرف سے زیورِ طبع سے آراستہ

ہوئی۔ اس کے بعد مولوی عبدالحق کی فرمائش پر شیخ چاند نے بھی اس کا ایک نسخہ تیار کیا جو 1955 میں چھپا۔ دس یا گیارہ سال بعد دیوی سنگھ چوہان کا مرتب کردہ متن دیوناگری میں مہاراشٹر بھاشا سبھا کی طرف سے شائع ہوا۔ ان تینوں نسخوں کے متن میں اختلاف ہے — 1963 میں مجلسِ اشاعتِ دکنی مخطوطات کا انضمام جب ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ہوگیا تو انسٹی ٹیوٹ نے طے کیا کہ ''پھولبن'' دوبارہ شائع کی جائے اور اس کی تدوینِ نو کی ذمے داری دکنی مخطوطات کے ماہر جناب محمد اکبرالدین صدیقی کو دی گئی جنھوں نے تمام دستیاب نسخے سامنے رکھ کر یہ متن تیار کیا ہے اور جس نسخے کے متن کو جہاں ترجیح دی ہے اس کی وجہ بھی بیان کی ہے۔ اختلافِ نسخ کی وضاحت حواشی میں کر دی گئی ہے۔

قومی اردو کونسل کا شائع کردہ زیرِ نظر نسخہ جناب محمد اکبرالدین کا تیار کردہ یہی نسخہ ہے جس پر موصوف نے ایک مفصل مقدمہ بھی تحریر کیا ہے جو مثنوی سے متعلق تمام مباحث کا جامعیت کے ساتھ احاطہ کرتا ہے۔

اتنی اہم کتاب میں کتابت کی غلطیوں کا راہ پاجانا قاری کے لیے پریشان کن ہوگا، بعض جگہ عبارت مکرر ہوگئی ہے، مکرر عبارت کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے لیکن بعض مقامات پر لفظ چھوٹ گئے ہیں اور عبارت بے ربط ہوگئی ہے۔ سنین میں بھی غلطیاں راہ پاگئی ہیں، ہجری سنہ پر عیسوی سنہ کی علامت ہے تو عیسوی سنہ پر ہجری سنہ کی۔ پڑھنے والا چوکنا نہ ہو تو زمانی مغالطوں کا شکار ہوگا۔ آئندہ اشاعت میں اس نوع کی غلطیوں کی درستی ضروری ہے۔

•

ثانوی مدارس میں تدریس/نیلسن ایل. بوسنگ

صفحات: 731، قیمت: -/60 روپے

ناشر: ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

مبصر: ظفر احمد نظامی

تعلیم انسانیت کا زیور ہے۔ اس نے انسان کی زندگی کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں ہمیشہ کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ اس کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ ہر دور میں تعلیم سے متعلق فلسفوں نے جنم لیا اور تبدیلیِ حالات کے مطابق طریقۂ تعلیم میں بھی تبدیلیاں کی جاتی رہیں۔ مختلف زمانوں میں اس سلسلے میں تجربات کیے جاتے رہے اور خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رہی۔ تعلیم کی اہمیت کے پیشِ نظر ہی عصرِ جدید میں ہر ملک میں وزارتِ تعلیم کا قیام عمل میں لایا گیا ہے اور اس کے بجٹ پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔

تعلیم کے میدان میں جو تبدیلیاں آرہی ہیں، درس و تدریس سے وابستہ اساتذہ کے لیے ان کا وقوف ضروری ہے۔ یہ کتاب جو انگریزی سے ترجمہ کی گئی ہے، اس ضرورت کی تکمیل کرتی ہے۔ اسے سات حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔

حصۂ اوّل میں ثانوی اسکول کی تعلیم سے متعلق بنیادی معلومات درج ہیں۔ حصۂ دوم تدریس سے متعلق درسیاتی سامان کی تنظیم کے بارے میں ہے اور ان مسائل کا تجزیہ کرتا ہے جو نصاب کو محیط ہیں۔ حصۂ سوم طریقۂ تدریس سے بحث کرتا ہے۔ لیکچر کی کیا اہمیت ہے؟ بلند خوانی کے تصور میں کیا تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں؟ مؤثر مطالعے کی لازمی شرائط کیا ہیں؟ قدر شناسی کی تعلیم کس طرح دی جاسکتی ہے، طالب علموں کی ترقی کا اندازہ کیوں کر کیا جاسکتا ہے؟ اندازۂ قدر کے نئے طریقۂ کار کون کون سے ہیں؟ ان تمام اہم مسائل نے اس حصے میں جگہ پائی ہے۔

حصۂ چہارم میں اسکول کے مقررہ اوقات میں پڑھانے کے طریقے درج ہیں۔ اس میں روزانہ کے کام پلان کی اہمیت سے بحث کی گئی ہے۔ توضیحات کی خصوصیات کیا ہیں؟ پڑھائی میں سوالات کیسے کیے جانے چاہئیں؟ ریویو اور مشقوں کو کیسے استعمال کیا جائے؟ توضیحات کی کیا افادیت ہے؟ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی کیا اہمیت ہے؟ اسکولوں اور جماعتوں میں ان کا استعمال کس طرح ہوسکتا ہے؟ ان تمام باتوں سے بحث کی گئی ہے۔ حصۂ پنجم تدریس کی تکنیکوں سے متعلق ہے جس میں تعلیمی ماحول کو بہتر بنانے اور طریقہ ہائے تعلیم کی تنظیم سے متعلق تفصیلات درج ہیں۔ کلاس روم میں پہلے دن کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نظم وضبط قائم رکھنے کے طریقوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ آخری حصے میں جدید تعلیم میں استاد کی اہمیت سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے سماجی مسائل اور شہری ذمے داریوں کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ غرض یہ کہ اس تصنیف میں تدریس سے متعلق تمام مسائل کا احاطہ کرتے ہوئے ان کا حل بھی پیش کیا گیا ہے۔ عموماً صاحبانِ تصانیف مسائل کی نشاندہی تو کردیتے ہیں لیکن ان کا حل تجویز نہیں کرتے لیکن یہ کتاب دونوں پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے اور تعلیم کے میدان میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، ان کی روشنی میں مسائل سے بحث کرتی ہے۔

کتاب میں ہر باب کے اختتام پر سوالات قائم کیے گئے ہیں جو ان مسائل کو واضح کردیتے ہیں جو اس باب میں اٹھائے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ہر باب کے بعد ان کتابوں کی فہرست بھی دے دی گئی ہے جن سے مواد کی فراہمی میں مدد لی گئی ہے اور جنھیں مزید مطالعے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں اور یہ تیسرا ایڈیشن ہے۔ ترجمہ آسان زبان میں ہے اور معیاری ہے۔ اگرچہ مصنف نیلسن ایل. بوسنگ کے الفاظ میں یہ کتاب پیشۂ تدریس سے تعلق رکھنے والے ان افراد کے لیے ہے جو استاد ہیں یا بننا چاہتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب تعلیم سے ذرا بھی شغف رکھنے والے فرد کے لیے دلچسپی اور معلومات کا اہم وسیلہ ہے۔

•

ہندستانی گاؤں/ ڈاکٹر شیاما چرن دوبے

مترجم: ڈاکٹر محمد عبدالقادر عمادی

صفحات: 255، قیمت:-/17 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی

مبصر: احمد کفیل

''ہندستانی گاؤں'' عثمانیہ یونیورسٹی کے سوشل سروس ایکسٹینشن پروجیکٹ پر کیے جانے والے کام کا ماحصل ہے۔ اس کے مصنف شیاما چرن دوبے نے 52-1951 میں اس پروجیکٹ کی قیادت کی تھی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے نہایت اہتمام کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے۔

قومی اردو کونسل، اردو زبان و ادب، تہذیب و ثقافت، سائنس اور فلسفہ، جدید ٹیکنالوجی اور تعلیم و ترقی سے متعلق کتابیں شائع کرنے والا ہندستان کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ عصری تعلیم کے ذریعے معاشی حصول اور سماجی ترقی اس کے بنیادی مقاصد میں شامل ہیں۔ کتابیں علم کا سرچشمہ رہی ہیں اور علم کے بغیر انسانی تہذیب کے ارتقا کو سمجھنا مشکل ہے۔ اسی مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے قومی اردو کونسل اعلا اور معیاری کتابیں شائع کرکے کم قیمتوں پر قارئین تک پہنچا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختصر عرصے میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب ''ہندستانی گاؤں'' بھی ایک ایسی ہی کتاب ہے جس کا دوسرا ایڈیشن ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

ہندستان کو ایک زرعی اور دیہی ملک کہا جاتا ہے۔ یہاں کی بیشتر آبادی گاؤں دیہاتوں میں بستی ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ گاؤں ہندستان کی سماجی زندگی کی بنیاد اور اہم اکائی ہے۔ یہاں سماج کا ارتقا عروج کی سمت میں مسلسل ہوتا رہا ہے۔ اس عروج اور ترقی میں ہر دور نے گزشتہ دور کے سماجی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی اصول وقوانین سے استفادہ کرکے نئے اصول و قوانین مرتب کیے ہیں۔ ''ہندستانی گاؤں'' میں ڈاکٹر شیاما چرن دوبے نے ملک کی مختلف کمیونٹیز، ان کے تمدن کے مختلف نمونوں اور ان کی تنظیم کی حقیقی تصویر کشی کی ہے اور ان کے مطالعات کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے اس کام میں نہ صرف عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ تحقیقات سے وابستہ اسکالرز سے استفادہ کیا بلکہ جب وہ لندن یونیورسٹی میں وزیٹنگ لکچرر تھے تو وہاں کے بھی معروف اسکالرز سے اس موضوع پر تبادلۂ خیال کیا اور اپنے تحقیقی مقالے کی تکمیل میں ان کی آرا سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔

ہندستانی گاؤں کی ہیئتی تشکیل بعض سماجی اور علاقائی روایات پر مشتمل رہی ہے۔ لباس، بات چیت، اطوار، نیز مکانات کی طرز تعمیر اس کے خاص نمونے ہیں۔ مختلف علاقوں میں دیہات کی تنظیم میں ایک حد تک تنوع دیکھنے کو ملتا ہے۔ لیکن ان علاقائی اختلافات کے باوجود دیہات میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ کچھ دیہاتوں کو امن پسند تو کچھ کو شورش پسند سمجھا جاتا ہے۔ کچھ اپنی فیاضی اور راست بازی کے لیے مشہور ہوتے ہیں تو کچھ کج خلقی کے لیے بدنام۔ کچھ گاؤں مقدمہ بازی سے دلچسپی رکھتے ہیں تو کچھ اپنی شان اور ظاہری نمائش کے اظہار پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی گاؤں ہیں جن کو اپنی نیک نامی کا بے حد خیال رہتا ہے۔ میل ملاپ یا اس کا فقدان بھی گاؤں کی خصوصیات میں شامل ہے۔ یہی وہ عناصر ہیں جو دیہات کو ایک امتیازی کردار عطا کرتے ہیں۔ اس لیے دیہات کے سماجی طریقوں اور ان کے محرکات کا مطالعہ سماجیاتی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔

مغرب میں اس سلسلے کی بہت سی اعلا اور معیاری کتابیں لکھی گئی ہیں جن سے کمیونٹی مطالعوں کو ترغیب ملی ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کا مقصد مصنف کے نزدیک ایک ہندستانی گاؤں کی زندگی کے چند پہلوؤں کی قریبی اور واضح تصویر پیش کرنا ہے، اس امید کے ساتھ کہ اس کتاب کو ہندستانی سماج سے دلچسپی رکھنے والے لوگ بہ طور خاص پڑھیں گے اور اس میں شک نہیں کہ آج اس پروجیکٹ کو ہندستانی صحافت میں کافی اہمیت اور شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے جہاں نوجوانوں کو ایک طرف اپنے مستقبل کی ترقی کے راستے ہموار کرنے میں مدد ملے گی وہیں ہندستان کی دیہی زندگی پر تحقیقاتی کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک محرک کی حیثیت رکھتی ہے۔

•

''اودھ کے فارسی گو شعرا'' / ڈاکٹر زہرہ فاروقی

صفحات: 346، قیمت:-/300 روپے

ناشر: ڈاکٹر زہرہ فاروقی، ڈی. 178، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

مبصر: مہتاب جہاں

آج جب علاقائی سطح پر ادب و تاریخ کے مطالعے کا رجحان بڑھ رہا ہے تو ضروری ہے کہ خطۂ اودھ کے اردو مصنفین کے علاوہ فارسی ادبا اور شعرا کی خدمات کا بھی باریک بینی سے مطالعہ کیا جائے۔ شاید وقت کی اسی اہم ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ڈاکٹر زہرہ فاروقی نے یہ کتاب پیش کی ہے۔ مصنفہ نے اودھ کے فارسی گو شعرا کے تذکرہ و تعارف کے علاوہ اس دور کی فارسی شاعری کے فکری رجحانات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے قابل قدر مواد فراہم کر دیا ہے۔

یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل اودھ کے سیاسی و تاریخی پس منظر، اودھ کی وجہ تسمیہ اور اس عہد کے تہذیبی محرکات کے بیان پر مشتمل ہے۔

باب دوم کا عنوان ہے نوابین وشاہانِ اودھ (مختصر سوانحی خاکے)، اس باب میں جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، اودھ کے نوابوں اور بادشاہوں کے حالات مختصراً بیان کیے گئے ہیں۔

باب سوم "نوابینِ اودھ کی تہذیبی وسماجی زندگی" میں نواب برہان الملک سے آخری نواب واجد علی شاہ تک کے سیاسی وثقافتی حالات قلمبند کیے گئے ہیں جبکہ باب چہارم "نوابینِ اودھ کی علمی وادبی سرپرستی" میں نوابینِ اودھ کی طرف سے اہلِ علم وقلم کی قدر افزائیوں کا ذکر ہے۔ باب پنجم میں نوابینِ اودھ کے دور کی چند اہم تصنیفات کا بیان ہے اور تذکرہ "گلشنِ سخن، سفینۂ ہندی، تذکرۂ ہندی، عقدِ ثریا" تاریخی کتابیں" سلطان التواریخ، چہار گلزار شجاعی لغات، ہفت قلزم، تاج اللغات، نفائس اللغات، متفرق موضوعات، دریائے لطافت، چہار گلشن، عشق نامہ، مراۃ الاقالیم اور مسیر طالبی" وغیرہ کا بالاختصار تذکرہ ہے۔

باب ششم کا عنوان "اودھ کے فارسی گوشعرا" ہے اور یہی کتاب کا اصل موضوع ہے۔ اس باب کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ حصہ (الف) میں صاحبِ دیوان شعرا کا ذکر ہے اور حصہ (ب) میں وہ شعرا شامل ہیں جن کے دواوین دستیاب نہیں ہیں۔ ان کی تعداد سو سے زائد ہے۔ یہ سب وہ شعرا ہیں جو کسی نہ کسی طور پر نوابوں کے عہد میں سرزمینِ اودھ سے وابستہ رہے۔ ان میں ایک بڑی تعداد ان مہاجر شعرا کی بھی ہے جو اصل میں دہلوی تھے لیکن دہلی کی بربادی اور زبوں حالی نے انھیں جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیا۔

•

آزادی مبارک اور دوسری منتخب کہانیاں/کملیشور

مرتب ومترجم: خورشید عالم
صفحات: 160، قیمت: -/50 روپے
ناشر: ساہتیہ اکادمی، رابندر بھون، فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی
مبصر: اظہار احمد ندیم

کملیشور ہندی کے مایۂ ناز ادیب ہیں جن کی کہانیوں کے گیارہ مجموعے، دس ناول، تنقید، سفرنامے اور خودنوشت منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کی کہانیوں کا انتخاب ڈاکٹر خورشید عالم نے "آزادی مبارک اور دوسری منتخب کہانیاں" کے نام سے کیا ہے جس میں آزادی مبارک، کہرہ، راجا نربنیا، چپل، گرمیوں کے دن، کھوئی ہوئی دشائیں، نیلی جھیل، انتظار، دلّی میں ایک موت، ماس کا دریا اور بیان وغیرہ کل گیارہ کہانیاں شامل ہیں۔

ہندی میں نئی کہانی کی بنیاد رکھنے والوں میں کملیشور کا نام بہت اہم ہے اگر یہ کہا جائے کہ ان کے بغیر یہ باب مکمل نہیں ہوسکتا تو بے جا نہ ہوگا۔ انھوں نے کہانیوں کا رشتہ عوام سے جوڑا اور اپنے موضوعات، کردار ان لوگوں کی زندگی سے لیے جہاں زندگی کے معنی خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتے جانا اور ہر پسند وناپسند، جائز وناجائز کو قسمت کی دیوی کی مہربانیاں مان لینا فرض ہے۔ فلاں واقعہ یا حادثہ کیوں ہوا اور یہ سلسلہ مزید کب تک چلے گا، یہ سوچنے پر پہرہ ہے۔ ایسی زندگیوں کا مطالعہ اور ان کے مشاہدے کے بعد ان کی لفظی تصویر بنانا مشکل ہوتا ہے مگر کملیشور کو اس فن پر دسترس حاصل ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں جن کہانیوں کا انتخاب کیا گیا ہے ان کے موضوعات ہماری سیاسی وسماجی صورت حال کا آئینہ ہیں۔ ان میں کہیں سہمی ہوئی زندگی، کہیں خاموش احتجاج اور کہیں ایسی چیخ جو اپنے اندر ردِّعمل کا طوفان سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کے علاوہ Metropolitan میں تیزی سے آ رہی تبدیلی، جہاں زندگی اپنے چولے اس تیزی سے بدل رہی ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا ہے کہ کس روپ کو اصل کہیں اور کس کو نقل۔ یہ فکر یہ سوال ہماری زندگی کے ہر موڑ پر موجود ہے۔

مجموعے کی پہلی کہانی آزادی مبارک میں اردو اور ہندی کے ادیب منٹو، دیوندر اسّر، بلراج مینرا، وغیرہ کرداروں کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ اس کہانی میں کملیشور نے سماجی اور معاشی طور سے آئے بدلاؤ کی منظرکشی کی ہے۔ اور وہ طبقہ جسے طبقۂ اشرافیہ کہا جاتا ہے، ان کا رہن سہن، زندگی کے انداز اور عوام وخواص کی زندگی کے زمین وآسمان کے خلا کو دکھایا گیا ہے جو آج بھی موجود ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دوملکوں کی سیاسی کشمکش بھی ہے جو دوملکوں کے لوگوں کے جذبات پر حاوی ہے۔ یعنی سیاست نے محبت پر قابو پا رکھا ہے۔ کہانی "چپل" ایک ہاسپٹل میں شروع ہوکر ختم ہوجاتی ہے۔ ہاسپٹل میں ایک مریض کا جس کا تعلق بہت پیسے والے گھرانے سے ہے، آپریشن ہو رہا ہے اور وہ درد کے مارے چیخ رہا ہے اور وہیں ایک آدمی جو نہایت غریب ہے، اس کے بیٹے کا پیر کاٹا جاتا ہے مگر بچے کی آواز ذرا بھی سنائی نہیں دیتی۔ مگر کہانی جوں جوں خاتمے کا سفر طے کرتی ہے، ایسا لگتا ہے کہ وہ آدمی جو چیخ رہا تھا اور جس کی آواز آپریشن تھیٹر کے باہر لگاتار سنائی دے رہی تھی، اس بچے کی خاموشی بھری آواز بازگشت کے سامنے مدھم پڑتی جا رہی ہے۔ "دلّی میں ایک موت" نہ صرف دلّی کی کہانی ہے بلکہ ہمارے ملک کے ہر بڑے شہر کی داستان ہے۔ سیٹھ دیوان چندر کے یہاں شادی کے دن مہنگی مہنگی اور چمکیلی کاروالوں کی لائن لگی تھی مگر جب اس کی موت ہوتی ہے تو گنتی کے دو چار لوگ اس کی ارتھی کو شمشان گھاٹ لے جاتے ہیں۔ یہ کہانی ہماری نئی تہذیب کا ماتم کرتی ہے۔

ڈاکٹر خورشید عالم کو اردو کے ساتھ ساتھ ہندی پر بھی عبور ہے، وہ چوبیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں جن میں وشنو پربھاکر کا ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ ناول "اردھ ناریشور" بھی شامل ہے۔ "آزادی مبارک اور دوسری کہانیاں" کے مطالعے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خورشید عالم نے اس آگ کے

دریا کو جسے ترجمہ کہا جاتا ہے، کامیابی سے پار کیا ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں کسی فن پارے کا ترجمہ کرنے کے لیے دونوں زبانوں کے مزاج اور روایت کا علم ضروری ہوتا ہے۔ خورشید عالم نے ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے محاورے سے واقفیت کو بھی ثابت کیا ہے۔

•

یوجنا (یومِ آزادی، خصوصی شمارہ) اگست 2003

صفحات: 70، قیمت: -/15 روپے

ناشر: یوجنا (اردو) کمرہ نمبر 538-A، پانچویں منزل، یوجنا بھون، سنسد مارگ، نئی دہلی-110001

''یوجنا'' (اردو) کا یہ خصوصی شمارہ ڈاکٹر ابرار رحمانی کی ادارت میں شائع ہونے والا پہلا شمارہ ہے، یہ شمارہ قارئین کے لیے آزادی کی سالگرہ کا ایک تحفہ ہے جس میں آزادی کے بعد سے اب تک کی تعلیمی، تہذیبی، اقتصادی اور تجارتی ترقی پر بے حد معلوماتی اور تجزیاتی مضامین پیش کیے گئے ہیں۔ موجودہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں ہمارا کیا مقام ہے؟ ہم نے ٹیلی کام میں اپنا کیا مقام بنایا ہے؟ دیگر میدانوں میں ہماری ترقی کی کیا رفتار ہے ان تمام موضوعات پر سینئر صحافیوں اور موضوع کے ماہرین نے مضامین تحریر کیے ہیں۔ مضامین کا حسنِ انتخاب مجلس ادارت کی صحافتی صلاحیتوں پر دال ہے۔

شمارہ ہر اس شخص کے لیے سودمند ہے جو دورِ حاضر میں ہندستان کی مختلف میدانوں میں ترقی سے واقف ہونا چاہتا ہے۔ وہ طلبہ جو مقابلہ جاتی امتحانوں کے لیے تیاری کر رہے ہیں ان کے لیے بھی خاص طور سے آبجیکٹیو سوالوں کے جواب کی تیاری میں کافی معاون ہوگا۔

•••

جنوبی ہند کی تاریخ

مصنف: کے ایل نیل کنٹھ

مترجم: آر کے بھٹناگر

جنوبی ہند کی تاریخ پر بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ کتاب میں جنوبی ہند کی قدیم تاریخ سے سترھویں صدی کے نصفِ اول تک کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 576، قیمت: 114

دکنی نثر کا انتخاب

مرتبہ: سیدہ جعفر

دکنی نثر کا یہ انتخاب دکن میں اردو نثر کی ابتدا سے فورٹ سینٹ جارج کالج کے زمانے تک کے مصنفین کا احاطہ کرتا ہے اور ان کی تصانیف کے نمائندہ منتخبات پر مشتمل ہے۔

صفحات: 168، قیمت 45

سخنورانِ گجرات

مرتب: سید ظہیر الدین مدنی

گجرات میں اردو شعر و ادب کی نشاندہی پندرھویں صدی کے نصف آخر سے کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں ابتدا سے 1950 تک کے شعرا کا تذکرہ اور ان کے کلام پر تبصرہ، سیاسی اور سماجی پس منظر کے ساتھ درج ہے۔

دوسرا ایڈیشن، صفحات: 340، قیمت: 77

کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ: ڈاکٹر سیدہ جعفر

گولکنڈہ کا پانچواں تاجدار محمد قلی قطب شاہ بہ یک وقت کئی اوصاف سے متصف تھا۔ اس کا ایک اہم وصف شعر گوئی بھی تھا۔ یہ اس کا مستند کلیات ہے جس میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی شامل ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 824، قیمت: 157

قطب مشتری

مصنف: اسد اللہ وجہی

''قطب مشتری'' اردو کی ابتدائی طبع زاد مثنویوں میں کئی لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ مثنوی متن کے ساتھ سو صفحوں پر مشتمل عالمانہ مقدمے نے کتاب کی قدر و قیمت مزید بڑھا دی ہے۔

(چوتھا ایڈیشن)

صفحات: 234، قیمت: 48

کلیاتِ سراج

سراج اورنگ آبادی

مرتب: عبد القادر سروری

سراج اورنگ آبادی اردو کے کلاسیکل شاعروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ دیباچے میں ان کی شاعرانہ خصوصیات اور ان کے شخصی اوصاف کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 732، قیمت: 138

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

انیتا مہاجن

بچوں کا گوشہ
سرسید ڈے کے موقعے پر خصوصی تحریر

سرسید احمد خاں

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے اور ساتھ ہی اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انھیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ کونسل نے چلڈرن بک ٹرسٹ کے اشتراک سے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔

ذیل میں قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب "ہمارے رہنما(جلد-9) " سے اقتباس پیش کیا جا رہا ہے۔

"ہمارے رہنما" میں سر سید احمد خاں کے علاوہ ایشور چندر ودیا ساگر، مدن موہن مالویہ، ویویکانند، جے۔ بی۔ کرپلانی اور وجے لکشمی پنڈت کے سوانحی خاکے بے حد دلنشیں اور عام فہم انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ بچوں کو ان رہنماؤں کے حالاتِ زندگی سے نہ صرف بھر پور واقفیت ہوگی بلکہ ان میں خود کو بہتر بنانے اور ملک کی خدمت کا جذبہ بھی بیدار ہوگا۔

152صفحات کی اس کتاب کی قیمت صرف 35.00 روپے ہے۔

1857 کی بغاوت کے دوران، ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ فوجوں نے، انگریزوں کو نکال باہر کرنے کے لیے مل کر لڑائیاں لڑیں۔ کمپنی کی فوج اور مخبروں میں ہندو اور مسلم دونوں شامل تھے۔ پھر بھی، برطانوی عہدیداروں اور واقعہ نویسوں نے، بغاوت کے لیے بڑی حد تک صرف مسلمانوں ہی کو ذمے دار ٹھہرایا۔ بغاوت کے بعد اسی اندازِ فکر سے انگریزوں نے اپنی پالیسی مرتب کی۔ انھوں نے سوچا کہ اگر آزادی کی اس جدوجہد میں مشترکہ فوجوں کو کامیابی مل جاتی ہے تو ہندستان میں مرہٹوں یا سکھوں کا نہیں بلکہ مسلمانوں کا اقتدار دوبارہ قائم ہوجائے گا۔ اس کے بعد سے، انگریزی سرکار نے مسلمانوں پر ظلم اور استبداد پوری قوت سے روا رکھا کیوں کہ وہ سمجھتی تھی کہ مسلمان زیادہ باغی ہوتے ہیں۔ اس لیے ان پر ظلم اور جبر کرنا، انگریزوں کی پالیسی کا ایک ضروری حصہ بن گیا۔ اس کے علاوہ ہندوؤں نے مغربی تعلیم کو اپنا لیا تھا اور انگریزی حکومت نے ان کی حوصلہ افزائی بھی شروع کردی تھی۔ یہ واقعی ہندستانی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک نازک دور تھا جب کہ غیر مسلم، معاشی اور سیاسی اعتبار سے، زیادہ مضبوط اور طاقت ور بنتے جارہے تھے مگر مسلمان پستی اور زبوں حالی کا شکار ہورہے تھے۔ ایسے حالات میں، ہندستان کے سیاسی افق پر ایک مسیحا نمودار ہوا اور وہ تھے سرسید احمد خاں۔

سرسید احمد خاں، 17 اکتوبر 1817 کو دہلی میں، سید متقی اور عظیم النسا کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کے اسلاف نے دہلی میں، مذہبی اور سیاسی حلقوں میں نمایاں مقام حاصل کرلیا تھا۔ ان کے آباواجداد شہنشاہ اکبر (1556 تا 1605) کے دورِ حکومت میں ہندستان آئے تھے اور انھیں دو سو سال سے زیادہ عرصے تک مغل شہنشاہوں کی سرپرستی حاصل رہی تھی۔

عالم گیر ثانی نے 1754 میں سرسید احمد خاں کے دادا سید ہادی کو، جواد علی خاں کے خطاب سے نوازا اور انھیں ایک ہزار پیادہ سپاہوں اور پانچ سو گھوڑ سواروں کا منصب دار بنادیا۔ انھیں بعد میں جواد الدولہ کا خطاب دے کر شاہ جہاں آباد کا محتسب اور کروڑی بنا دیا گیا۔ 1774 میں انھیں، قاضی لشکر کے

عہدے پر بھی فائز کیا گیا۔ ان کے انتقال پر یہ خطابات ان کے لڑکے سید متقی کو عطا کیے گئے، یہ شاہ عالم سے قریب تھے۔ مغل دربار میں ان کا بڑا اثر ورسوخ تھا۔ سید متقی، مذہبی مزاج کے انسان تھے اور ہندستان کے نامی گرامی مسلم درویش شاہ غلام علی کے مرید تھے۔

سرسید احمد خاں کے ننہیال کے اسلاف میں ان کے نانا خواجہ فریدالدین احمد اور ان کے بھائی خواجہ نجیب الدین (1747 تا 1828) نے اپنی محنت اور ریاضت سے سماج میں خصوصی مقامات حاصل کر لیے تھے۔ خواجہ نجیب (بعد ازاں شاہ فدا حسین) بڑے درجے کے مجذوب مانے گئے۔ خواجہ فریدالدین احمد، ایک بلند پایہ ریاضی داں کی حیثیت سے مشہور ہوئے، ساتھ ہی انھیں ایک اچھے محقق اور منتظم ہونے کی شہرت بھی حاصل ہوئی۔ اس لیے ایسٹ انڈیا کمپنی اور پھر مغل حکومت میں بھی اچھے اور باعزت عہدوں پر فائز رہے۔ خواجہ فریدالدین صرف سیاست داں ہی نہیں تھے بلکہ ایک روحانی مزاج کے آدمی تھے اور رسول شاہی درویش، مکہ شاہ کے مرید بھی تھے۔

سرسید احمد خاں، کی پرورش ان کے ننہیال میں ایک ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں مغل دربار سے ربط ضبط بھی تھا اور انگریزوں سے وفاداری کی روایات بھی ملتی تھیں۔ ان کی کردار سازی اور شخصیت کی اٹھان میں ننہیال کے ان اثرات کا بڑا دخل رہا۔

ان کی والدہ عظیم النسا نے ان میں اونچے آدرشوں اور کڑوی سچائیوں کی پہچان پیدا کر دی تھی۔ انھوں نے انھیں چند ابتدائی کتابیں بھی پڑھائی تھیں، ساتھ ہی قرآن کی تعلیم بھی دی تھی۔ وہ زندگی میں شائستگی اور باقاعدگی کو بڑی اہمیت دیتی تھیں۔ بارہ برس کی عمر میں سرسید احمد خاں نے ایک عمر رسیدہ ملازم کو تھپڑ مارا تھا۔ جب اس واقعے کی اطلاع ان کی والدہ کو ہوئی تو انھوں نے سرسید احمد خاں کو گھر سے باہر کر دیا تھا، تین دن بعد جب سرسید احمد خاں نے اس ملازم سے معافی مانگی تب ہی انھیں گھر میں آنے دیا گیا۔

والدہ کی سوجھ بوجھ اور توہمات سے نفرت کا سرسید احمد خاں پر بڑا اثر پڑا۔ انھوں نے ماں کی طرف سے انسان دوستی اور صبر ورثے میں پایا۔

سرسید احمد خاں کی زندگی پر ایک اور بڑا اثر خواجہ زین الدین خاں کی شخصیت کا بھی پڑا، جو ان کے ماموں تھے۔ خواجہ صاحب مختلف صلاحیتوں کے مالک تھے اور ان کی دلچسپیاں موسیقی، ریاضی سے لے کر پتنگ بازی تک پھیلی ہوئی تھیں۔

سرسید احمد خاں جب چھوٹے تھے، مغل محلات کے شہزادوں میں ہر دل عزیز تھے۔ وہ شہزادوں کے ساتھ مختلف کھیل کھیلتے تھے۔ ان دنوں دربار میں، فنونِ لطیفہ جیسے موسیقی، خطاطی، ہاتھی دانت پر چھوٹی تصویریں بنانا اور شاعری کا ذوق عام تھا۔ درباریوں کے پسندیدہ کھیل کود میں، مرغ بازی، بلبل اور باز پالنا، کبوتر بازی وغیرہ شامل تھے۔ دولت اور وقت کی کوئی قیمت نہ تھی۔ سید احمد خاں کو شہزادگان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے، آخری مغل دربار کی شان و شوکت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔

سید احمد خاں ذہنِ رسا کے مالک تھے۔ وہ اکثر، سنجیدہ اور تجسس بھرے ہوئے سوالات کیا کرتے تھے۔ ایک دن جب وہ ابھی چھ برس کے تھے، اتفاق سے اپنے نانا کے ایوان خانے میں دوڑ گئے۔ انھوں نے، جنرل لونی کو اپنے نانا کے ساتھ بات کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ لوٹ جانا چاہتے تھے مگر بلوا لیے گئے۔ جنرل نے پیار سے انھیں اپنے گھٹنوں پر بٹھالیا۔ سید احمد خاں نے اس سے سوال کیا'' آپ اپنی ہیٹ میں پر کیوں لگاتے ہیں، اور آپ کے کوٹ پر اتنے بہت سے سونے کے بٹن کیوں لگے ہوئے ہیں۔ جنرل سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ اس نوجوان کے تجسس پر خوش ہوکے رہ گیا۔

اکبر شاہ ثانی کے دربار میں، سید احمد خاں کی ملاقات عظیم ہندستانی مصلح راجہ رام موہن رائے سے ہوئی۔ اس کم سنی کے باوجود، انھوں نے راجہ رام موہن رائے کے بارے میں جو تاثر قائم کیا وہ ان کے علم و فضل، سنجیدگی، شائستگی اور تہذیب سے تعلق رکھتا تھا۔

سید احمد خاں جب چار برس کے تھے، تو ان کی تسمیہ خوانی کی رسم (بچے کی تعلیم کی شروعات) ان کے والد کے مرشد مولوی شاہ غلام علی نے انجام دی۔

سید احمد خاں کی پہلی استاد خود ان کی ماں تھیں۔ مگر کچھ عرصے بعد ایک قابل خاتون کو انھیں قرآن کی تعلیم دینے پر معمور کیا گیا۔ ایک اور نامور عالم مولانا حمیدالدین نے انھیں ابتدائی فارسی پڑھائی۔ اس کے بعد انھوں نے عربی سیکھنی شروع کر دی۔ ان کے چچا خواجہ زین الدین خاں نے ریاضی کی تعلیم دی۔ پھر یہ آلات فلکیات میں دلچسپی لینے لگے۔

انھوں نے حکیم غلام حیدر خاں سے طب سیکھی جو اس زمانے میں دہلی کے ایک ممتاز حکیم تھے۔ پھر انھی کی نگرانی میں کچھ عرصے کے لیے طبابت بھی کی۔

اٹھارہ برس کی عمر میں انھوں نے ابتدائی تعلیم مکمل کر لی۔ لیکن کتابوں سے ان کی دلچسپی قائم رہی اکثر وہ، صہبائی، غالب اور آزردہ جیسے عالموں اور شاعروں کی صحبت میں وقت گزارا کرتے تھے۔

1838 میں جب سید متقی کا انتقال ہوگیا تو فرماں رواؤں نے وظیفہ بند

کردیا۔ سید احمد خاں اور ان کے بھائی سید محمد کو ملازمتیں تلاش کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اگر چہ سید احمد خاں کے اہلِ خاندان اور رشتے دار چاہتے تھے کہ مغلیہ خاندان سے تعلقات نہ توڑے جائیں مگر انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی میں کام کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ انھوں نے، دہلی کے صدر امین مولوی خلیل اسد خاں کے تحت امیدوار کی حیثیت سے کام کرنا شروع کردیا اور تھوڑے ہی دنوں میں سرشتہ دار (لیڈر کلرک) کی حیثیت سے متعین کیے گئے۔ 1839 میں انھیں آگرہ میں کمشنر کے دفتر میں، نائب منشی مقرر کیا گیا۔

1840 میں سید احمد خاں نے جام جم کے نام سے ہندستان کے حکمرانوں کا ایک شجرا شائع کیا۔ اس کے بعد انھوں نے قوانین، دیوانی کا ایک خلاصہ مرتب کیا جسے انتخاب الاخواں کے نام سے انھوں نے اور اُن کے بھائی نے مل کر شائع کیا۔ یہ کتاب، ان امیدواروں کے لیے بہت مفید تھی جو منصفی کا امتحان دیتے تھے۔ منصفی کا امتحان پاس کرنے کے بعد، سید احمد خاں کو 1841 میں مین پوری کا منصف مقرر کیا گیا۔ تقرر کے دو ہفتے بعد ہی ان کا تبادلہ فتح پور سیکری کردیا گیا جہاں وہ چار برس کام کرتے رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے تین رسالے تصنیف کیے، جن میں ایک تھا پیغمبر اسلام کی سوانح عمری سے متعلق اور دوسرے تھے، تحفہ الاثنا عشری کے دو ابواب کا ترجمہ اور جرثقیل سے متعلق بو علی کے فارسی کتابچے معیار العقول کا ترجمہ۔

سید احمد خاں نے اپنا تبادلہ دہلی کروا لیا تھا۔ دہلی میں سید احمد خاں نے مسلمانوں کے مروج علوم جیسے فقہ، اصولِ فقہ، حدیث اور قرآنیات کا مطالعہ کیا۔ جب بھی انھیں وقت ملا، انھوں نے مذہبی علوم کا گہرا مطالعہ کیا۔ ان کے اساتذہ میں مولوی نوازش علی، مولوی فیض الحسن اور مولانا مخصوص اللہ شامل تھے۔ آخر الذکر شاہ ولی اللہ کے سلسلے سے جڑے ہوئے تھے اور پیغمبر اسلام کی احادیث کے ایک عالم کی حیثیت سے معروف تھے۔ انھوں نے سید احمد خاں کو مشکوٰۃ، مسلم اور تبریزی کے کچھ حصے پڑھائے اور پورے قرآن حکیم کی تعلیم دی۔

سید احمد نے اپنے بھائی کے جریدے ''سید الاخبار'' کا کام سنبھالا مگر اسے اچھی آمدنی کا ذریعہ نہ بنا سکے۔ انھوں نے 1847 میں آثارِ قدیمہ سے متعلق ایک کتاب'' آثار الصنادید' مرتب کی۔ اسی کتاب سے ہندستان میں آثارِ قدیمہ کے مطالعہ جات کی بنیاد قائم ہوئی۔

سید احمد خاں نے 1854 میں آثار الصنادید کا ترمیم و اضافہ شدہ دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ اس کام پر نظرِ ثانی کے دوران، شاہ جہاں پور کے کلکٹر اور مجسٹریٹ مسٹر روبرٹس نے ان کی کافی مدد کی اور مشورہ دیا کہ مواد کے بیشتر حصے کو ازسرِ نو ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ کچھ عرصہ بعد 1861 میں اسی کتاب کا فرانس کے مشہور مشرق نگار گارساں دی تاسی نے فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب کی قدر شناسی کے سلسلے میں سید احمد خاں کو 1864 میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا اعزازی فیلو منتخب کرلیا گیا۔

1855 میں سید احمد خاں بجنور کے صدر امین مقرر کیے گئے۔ انھوں نے ضلع بجنور کی ایک جامع تاریخ مرتب کی۔ مگر 1857 کی بغاوت کے دوران یہ مسودہ تلف ہوگیا۔

1857 کی بغاوت کے وقت سید احمد خاں بجنور ہی میں تھے۔ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر انھوں نے بجنور میں مقیم یورپ کے باشندوں کو بہ حفاظت تمام روڑکی بھیجا۔ جان اسٹریچی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ'' سید احمد خاں نے جرأت مندی سے جو نمایاں کام انجام دیا ہے اس سے بہتر نیکی کا کام کسی نے نہیں کیا۔''

سید احمد خاں نے بغاوت میں شریک ہونے سے انکار کردیا تھا۔ وہ ضلع انتظام کو مستعدی سے چلانے میں اس وقت تک مصروف رہے جب تک کہ انقلابیوں نے انھیں شکست نہ دے دی اور جان بچا کر فرار ہوجانے پر مجبور نہ کیا۔ چند احباب کی مدد سے مگر بڑی مشکل سے وہ انقلابیوں سے بچ کر کئی ہفتوں تک خطرات کا سامنا کرتے ہوئے بالآخر میرٹھ پہنچ گئے۔

جب انھوں نے سنا کہ ان کا گھر لوٹ لیا گیا اور ان کے رشتے کے بھائیوں اور چچاؤں کو قتل کردیا گیا تو وہ دہلی گئے تاکہ اپنی والدہ کو میرٹھ لے آئیں۔ لیکن مرحومہ کا کچھ ہی دنوں بعد انتقال ہوگیا کیوں کہ وہ دہلی کے جان لیوا حادثات کے صدمے کو برداشت نہ کر پائیں۔ سید احمد خاں کو، ان کی خدمات کے انعام کے طور پر انگریزی سرکار نے ایک بڑا علاقہ پیش کیا۔ جسے انھوں نے لوگوں کی تکلیفوں کو دیکھتے ہوئے قبول نہیں کیا۔ انھوں نے کہا'' کچھ دنوں سے میں سوچتا رہا ہوں، میرا یقین کیجیے، اس صدمے نے مجھے بوڑھا کردیا ہے اور میرے بال سفید ہوگئے ہیں۔''

اسی طرح سال 1857، ہندستان کی تاریخ کے ساتھ ساتھ سید احمد خاں کی زندگی میں بھی ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔

اپریل 1858 میں سید احمد خاں کو صدر الصدور کی حیثیت سے مراد آباد بھیجا گیا۔ ایک سال بعد انھیں ضبط شدہ املاک کی اپیلوں کی سماعت کرنے والے دو رکنی خصوصی کمیشن کا رکن بنا دیا گیا۔ انھوں نے مراد آباد کے قیام کے دوران '' تاریخ سرکشی بجنور'' لکھی۔

انھوں نے Committee for Better Diffusion and Advancement of learning Among the Mohammadans of India کے نام سے ایک کمیٹی قائم کی۔ کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ مغربی علوم سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کو اپنی تعلیم کا آپ انتظام کرنا چاہیے اور ساتھ ہی مشرقی تہذیب کی اخلاق سے مالا مال اپنی ثقافتی دولت کی بھی حفاظت کرنا چاہیے۔ کمیٹی نے مسلمانوں کے لیے ایک کالج کے قیام کی تجویز بھی پیش کی۔

فروری 1873 میں سید احمد خاں کے لڑکے سید محمود نے اس ادارے کی تنظیم کے بارے میں ایک مفصل اسکیم مرتب کی جس میں کالج کے اقامتی کردار پر زور دیا گیا تھا اور ساتھ ہی اسے انگریزی سرکار کے کنٹرول سے آزاد رکھنے کی بات خصوصیت سے کہی گئی تھی۔

اس کے بعد اراضی اور سرمایے کی فراہمی کا مسئلہ درپیش ہوا۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد سید احمد خاں وہ اراضی حاصل کر پائے جس پر آج کی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کھڑی ہے۔ سرمایہ جمع کرنے کے لیے سید احمد خاں کو سارے ہندستان سے چندے اور عطیات جمع کرنے پڑے۔ جیسے جیسے سرمایہ اکٹھا ہونے لگا، عمارت کی تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا۔ سید احمد خاں چاہتے تھے کہ عمارت خوبصورت اور شان دار ہوں۔ وہ خود ہی اپنے آرکیٹیکٹ تھے، خود ہی اپنے انجینئر اور خود ہی اپنے ٹھیکے دار۔ علی گڑھ کی چلچلاتی دھوپ میں وہ کام کرنے والوں کے ساتھ کھڑے رہتے اور ہر کام کے بارے میں ہدایات دیتے۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، علی گڑھ میں 24 مئی 1875 کو قائم ہو گیا۔ سید احمد خاں 1876 میں ملازمت سے سبک دوش ہو گئے۔ پھر انھوں نے اپنا سارا وقت ایم۔اے۔او کالج کے لیے وقف کر دیا۔

ہندستان کے وائسرائے لارڈ لٹن نے کالج کا سنگ بنیاد رکھا۔ سید احمد خاں چاہتے تھے کہ کالج میں طالب علموں کے لیے مغربی علوم کی تعلیم کا انتظام مشرقی تہذیبی قدروں کے ساتھ رہے۔ انھوں نے عربی، فارسی اور سنسکرت کی تعلیم کو پھر سے جاری کیا۔ انھوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ ایم۔اے۔او کالج، انگریزی سرکار کے کنٹرول سے باہر ایک آزاد ادارے کی طرح کام کرے۔ انھوں نے طلبہ کی اقامتی زندگی پر بھی زور دیا۔

1883 میں سید احمد خاں نے مسلم طلبہ کو سول سروس امتحانات دینے کی غرض سے انگلینڈ جانے کے لیے محمڈن فنڈ ایسوسی ایشن قائم کی۔ 1886 میں انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کیا کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ ساری مسلم آبادی کے لیے صرف ایک کالج کافی نہیں ہے۔ یہ کانفرنس مسلم دانشوروں کے لیے ایک مرکز بن گئی جہاں وہ اپنی ملت کی علمی ضروریات پر تبادلۂ خیال کر سکیں اور تعلیمی سرگرمیوں کو بڑھانے کے لیے حالات پیدا کر سکیں۔

1898 میں ایم۔اے۔او کالج کے مختلف کلاسوں میں 285 مسلم اور 645 ہندو طالب علم داخل تھے۔

سید احمد خاں کی زندگی کا آخری زمانہ کامیابی اور ناکامی دونوں کے احساسات سے بھرا ہوا تھا۔ 1888 میں انھیں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ ہال میں ایک رسمی تقریب میں اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ دوسرے برس، ایڈن برگ یونی ورسٹی نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں LLD کی ڈگری عطا کی۔

1889 میں انھوں نے ایم۔اے۔او کالج کے انتظام میں باقاعدگی لانے کی غرض سے Trustees Bill کا مسودہ تیار کیا۔ سید احمد خاں کو اس وقت دھکا لگا جب کثرت رائے سے پاس ہو جانے کے باوجود ایک گروپ نے اس کی شدید مخالفت کی۔ اس کے بعد انھیں نے مزید تکلیف اس وقت ہوئی جب کالج کے ہیڈ کلرک نے ٹرسٹیوں کے جعلی دستخط کر کے کالج کی رقم میں سے غبن کیا۔

سید احمد خاں کی بیماری نے بھی انھیں اندر سے کمزور کر دیا تھا۔ ذاتی رنج و تکلیف کے باوجود وہ عوام کے مسائل پر دھیان دیتے رہے۔ ایک مختصر سی بیماری کے بعد سید احمد خاں 27 مئی 1898 کو وفات پا گئے۔

سید احمد خاں کی تعلیمی تحریک کا بنیادی مقصد اونچے زمرے کے مسلمانوں کے مختلف مسائل کا حل ڈھونڈ نکالنا تھا، ساتھ ہی ساتھ وہ ان کی قدامت پسندی کو ختم کرنا چاہتے تھے، ان کے تعصبات کو مٹانا چاہتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ مسلمان مغربی علوم کو اختیار کریں۔ انھوں نے خود اعتمادی اور عزتِ نفس کو بحال کیا اور انگریزوں اور مسلمانوں میں سیاسی مفاہمت پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

سید احمد خاں کی وفات سے مسلم قیادت میں ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا۔ مسلمانوں نے ان کی وفات کے بعد وہ رویہ اختیار کیا جو خود سید احمد خاں کا پسندیدہ رویہ تھا۔ مسلمانوں نے محسن الملک کی قیادت میں ایک یادگار فنڈ کمیٹی کی ابتدا کی تا کہ سید احمد خاں کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرتے ہوئے ایم۔اے۔او کالج کو ایک یونی ورسٹی میں تبدیل کیا جا سکے۔

سید احمد خاں کا پیغام جو ترقی کی ضرورت اور اس کے لیے کام کرنے کی جرأت پر مبنی تھا، اس نے مسلمانوں کے اندر واقعی روح پھونک دی تھی۔

□□□

انھوں نے Committee for Better Diffusion and Advancement of learning Among the Mohammadans of India کے نام سے ایک کمیٹی قائم کی۔ کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ مغربی علوم سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کو اپنی تعلیم کا آپ انتظام کرنا چاہیے اور ساتھ ہی مشرقی تہذیب کی اخلاق سے مالا مال اپنی ثقافتی دولت کی بھی حفاظت کرنا چاہیے۔ کمیٹی نے مسلمانوں کے لیے ایک کالج کے قیام کی تجویز بھی پیش کی۔

فروری 1873 میں سید احمد خاں کے لڑکے سید محمود نے اس ادارے کی تنظیم کے بارے میں ایک مفصل اسکیم مرتب کی جس میں کالج کے اقامتی کردار پر زور دیا گیا تھا اور ساتھ ہی اسے انگریزی سرکار کے کنٹرول سے آزاد رکھنے کی بات خصوصیت سے کہی گئی تھی۔

اس کے بعد اراضی اور سرمایے کی فراہمی کا مسئلہ درپیش ہوا۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد سید احمد خاں وہ اراضی حاصل کر پائے جس پر آج کی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کھڑی ہے۔ سرمایہ جمع کرنے کے لیے سید احمد خاں کو سارے ہندستان سے چندے اور عطیات جمع کرنے پڑے۔ جیسے جیسے سرمایہ اکٹھا ہونے لگا، عمارت کی تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا۔ سید احمد خاں چاہتے تھے کہ عمارت خوبصورت اور شان دار ہوں۔ وہ خود ہی اپنے آرکیٹیکٹ تھے، خود ہی اپنے انجینئر اور خود ہی اپنے ٹھیکے دار۔ علی گڑھ کی چلچلاتی دھوپ میں وہ کام کرنے والوں کے ساتھ کھڑے رہتے اور ہر کام کے بارے میں ہدایات دیتے۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، علی گڑھ میں 24 مئی 1875 کو قائم ہو گیا۔ سید احمد خاں 1876 میں ملازمت سے سبک دوش ہو گئے۔ پھر انھوں نے اپنا سارا وقت ایم.اے.او. کالج کے لیے وقف کر دیا۔

ہندستان کے وائسرائے لارڈ لٹن نے کالج کا سنگ بنیاد رکھا۔ سید احمد خاں چاہتے تھے کہ کالج میں طالب علموں کے لیے مغربی علوم کی تعلیم کا انتظام مشرقی تہذیبی قدروں کے ساتھ رہے۔ انھوں نے عربی، فارسی اور سنسکرت کی تعلیم کو پھر سے جاری کیا۔ انھوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ ایم.اے.او. کالج، انگریزی سرکار کے کنٹرول سے باہر ایک آزاد ادارے کی طرح کام کرے۔ انھوں نے طلبہ کی اقامتی زندگی پر بھی زور دیا۔

1883 میں سید احمد خاں نے مسلم طلبہ کو سول سروس امتحانات دینے کی غرض سے انگلینڈ جانے کے لیے محمڈن فنڈ ایسوسی ایشن قائم کی۔ 1886 میں انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کیا کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ ساری مسلم آبادی کے لیے صرف ایک کالج کافی نہیں ہے۔ یہ کانفرنس مسلم دانشوروں کے لیے ایک مرکز بن گئی جہاں وہ اپنی ملت کی علمی ضروریات پر تبادلۂ خیال کر سکیں اور تعلیمی سرگرمیوں کو بڑھانے کے لیے حالات پیدا کر سکیں۔

1898 میں ایم.اے.او. کالج کے مختلف کلاسوں میں 285 مسلم اور 645 ہندو طالب علم داخل تھے۔

سید احمد خاں کی زندگی کا آخری زمانہ کامیابی اور ناکامی دونوں کے احساسات سے بھرا ہوا تھا۔ 1888 میں انھیں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ ہال میں ایک رسمی تقریب میں اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ دوسرے برس، ایڈن برگ یونی ورسٹی نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں LLD کی ڈگری عطا کی۔

1889 میں انھوں نے ایم.اے.او. کالج کے انتظام میں باقاعدگی لانے کی غرض سے Trustees Bill کا مسودہ تیار کیا۔ سید احمد خاں کو اس وقت دھکا لگا جب کثرت رائے سے پاس ہو جانے کے باوجود ایک گروپ نے اس کی شدید مخالفت کی۔ اس کے بعد انھیں نے مزید تکلیف اس وقت ہوئی جب کالج کے ہیڈ کلرک نے ٹرسٹیوں کے جعلی دستخط کر کے کالج کی رقم میں سے غبن کیا۔

سید احمد خاں کی بیماری نے بھی انھیں اندر سے کمزور کر دیا تھا۔ ذاتی رنج و تکلیف کے باوجود وہ عوام کے مسائل پر دھیان دیتے رہے۔ ایک مختصر سی بیماری کے بعد سید احمد خاں 27 مئی 1898 کو وفات پا گئے۔

سید احمد خاں کی تعلیمی تحریک کا بنیادی مقصد اونچے زمرے کے مسلمانوں کے مختلف مسائل کا حل ڈھونڈ نکالنا تھا، ساتھ ہی ساتھ وہ ان کی قدامت پسندی کو ختم کرنا چاہتے تھے، ان کے تعصبات کو مٹانا چاہتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ مسلمان مغربی علوم کو اختیار کریں۔ انھوں نے خود اعتمادی اور عزت نفس کو بحال کیا اور انگریزوں اور مسلمانوں میں سیاسی مفاہمت پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

سید احمد خاں کی وفات سے مسلم قیادت میں ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا۔ مسلمانوں نے ان کی وفات کے بعد وہ رویہ اختیار کیا جو خود سید احمد خاں کا پسندیدہ رویہ تھا۔ مسلمانوں نے محسن الملک کی قیادت میں ایک یادگار فنڈ کمیٹی کی ابتدا کی تاکہ سید احمد خاں کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرتے ہوئے ایم.اے.او کالج کو ایک یونی ورسٹی میں تبدیل کیا جا سکے۔

سید احمد خاں کا پیغام جو ترقی کی ضرورت اور اس کے لیے کام کرنے کی جرأت پر مبنی تھا، اس نے مسلمانوں کے اندر واقعی روح پھونک دی تھی۔

□□□

تحریر: سروجنی سنہا
ترجمہ: صفدر نقوی

نمک ستیہ گرہ کا سپاہی

گاندھی جینتی کے موقعے پر قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب ''نمک ستیہ گرہ کا سپاہی'' سے اقتباس پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کتاب میں گاندھی جی کے ذریعے شروع کیے گئے نمک قانون کو توڑنے کی تحریک پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ 88 صفحات کی اس کتاب کی قیمت صرف 20.00 روپیے ہے۔

انھیں چلتے ہوئے تین ہفتے سے زیادہ ہو گئے تھے۔ گرمی نے دیہی علاقے کو بھورا اور گرد آلود کر دیا تھا۔ روز بروز چلنا کافی مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ اب وہ سمندر کے کنارے ڈانڈی گاؤں پہنچ گئے تھے۔ بحر عرب کی لہریں ساحل سے کھیل رہی تھیں۔

وہ قانون توڑنے کے لیے آئے تھے۔ اور یہ وہ جگہ تھی جہاں قانون توڑنا تھا۔ قانون کی رو سے نمک بنانا یا سمندر کے کنارے پڑے ہوئے نمک کو اُٹھانا جرم تھا۔

ان کے لیڈر موہن داس کرم چند گاندھی تھے۔ انھیں پورے ہندستان کے لوگ گاندھی جی یا مہاتما گاندھی کے نام سے جانتے تھے۔ ڈانڈی مارچ ان کی ستیہ گرہ تحریک کا ایک حصہ تھا۔ ستیہ گرہ یعنی سچائی کے راستے پر چلنا۔

چوبیس برس پہلے گاندھی جی جنوبی افریقہ میں رہتے تھے۔ وہاں ستیہ گرہ کے ذریعے انھوں نے حکومت کو قانون واپس لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ ٹرانسوال میں اس وقت ہندستانیوں کو بہت پریشانی اور ذلّت اُٹھانی پڑتی تھی۔ انھیں حکومت سے ایک سرٹیفکیٹ لینا پڑتا تھا جس پر ان کی انگلیوں کے نشان ہوتے تھے۔ اس سرٹیفکیٹ کے ذریعے انھیں اس ملک میں رہنے کا حق حاصل ہوتا تھا۔ ہندستان میں بھی انھوں نے وہی طریقے اختیار کیے۔ انگریزی حکومت کے اقتدار کو عدم تعاون سے پُر امن طریقے سے بغیر تشدد کے جھکانے کا ارادہ کیا۔

انگریز 330 سال پہلے ہندستان آئے تھے، سورت کے بندرگاہ پر اُترے تھے۔ اسی ڈانڈی گاؤں سے کوئی پچاس کلومیٹر دور۔ جہاں گاندھی جی اور ان کے ساتھی انگریزی حکومت کے خلاف تحریک شروع کرنے والے تھے۔

انگریز تجارت کرنے کے لیے ہندستان آئے تھے اور حکومت پر قبضہ کر لیا تھا۔ 1599 میں مشرقی ملکوں سے تجارت کرنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی بنائی گئی تھی۔ 1600 میں کپتان ہاکنس نے سورت کے بندرگاہ پر ایک چھوٹے سے جہاز کا لنگر ڈالا۔ چند سال بعد انگریز مغل شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں آگرہ پہنچے۔ شہنشاہ نے ہاکنس کو خوش آمدید کہا اور ممبئی کے شمال حصے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو تجارت کرنے کی اجازت دے دی۔

تجارت میں بہت نفع ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی بہت مال دار ہو گئی۔ جب اٹھارہویں صدی میں مغل حکومت کمزور ہو گئی، ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگی تو کمپنی نے تجارت میں حصہ لینا شروع کیا اور رفتہ رفتہ طاقت ور ہو گئی۔ انیسویں صدی کے شروع ہی میں ملک کے بڑے حصے پر کمپنی کا قبضہ ہو چکا تھا۔ شروع ہی سے انگریزی حکومت کی مخالفت ہوتی رہی۔ 1857 میں ایک مسلح بغاوت ہوئی، لیکن دبا دی گئی۔ انگلستان کی حکومت نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ختم کر دیا اور ہندستان کا انتظام خود سنبھال لیا۔

ہندستانی، غیر ملکی حکومت سے مطمئن تو نہ تھے لیکن گاندھی جی اور دوسرے لیڈروں نے پہلی عالمی جنگ میں انگریزوں کی مدد کی۔ انھیں امید تھی کہ جنگ کے خاتمے پر ان کو آزادی مل جائے گی۔ امید کے خلاف جنگ ختم ہونے کے بعد حکومت نے آزادی کی تحریک کو دبانے کی کوشش کی۔ گاندھی جی اور انڈین نیشنل کانگریس نے احتجاج کے طور پر 6 اپریل 1919 کو پورے ہندستان میں ہڑتال کرنے کا اعلان کیا۔ پورے ملک میں دکانیں اور فیکٹریاں بند رہیں۔ لوگ کام پر نہ گئے۔ اسکولوں میں درجے خالی رہے۔

13 اپریل 1919 کو امرتسر کے جلیاں والا باغ میں ایک عام جلسہ ہوا۔ جلسوں پر پابندی تھی۔ لیکن بہت بڑی تعداد میں لوگ جلسے میں آئے۔ جلسہ پوری طرح پُر امن تھا۔ پھر بھی امن قائم کرنے کے نام پر فوج بلائی گئی۔ جنرل ڈائر نے ہندستانیوں کو سبق سکھانے کے لیے گولی چلانے کا حکم دیا۔ سیکڑوں آدمی مارے گئے اور زخمی ہوئے۔

پورے ملک میں ہیجان پھیل گیا۔ گاندھی جی نے عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا اعلان کیا۔ انھوں نے لوگوں سے بدیشی کپڑا پہننا چھوڑ دینے کے لیے کہا۔ انھوں نے چرخے پر کتے ہوئے کپڑے پہننے کے لیے کہا۔ اس سے انگلستان کی معاشی حالت پر چوٹ پڑی۔ ہندستان انگریزی کپڑے کی بہت منافع بخش منڈی تھا۔ ساتھ ہی اس ملک

کے غریب دیہاتی لوگوں کے لیے روزگار کا ذریعہ بھی تھا۔

گاندھی جی نے پورے ہندستان کا دورہ کیا۔ گاؤں، قصبوں اور شہروں سب میں پہنچے۔ ہر جگہ ان کو دیکھنے اور سننے کے لیے زبردست بھیڑ جمع ہوتی تھی۔ ان کی سادگی، بے تکلفی اور درویشوں جیسی زندگی کی وجہ سے لوگ ان سے محبت بھی کرتے تھے اور ان کی عزت بھی۔

انھوں نے لوگوں سے کہا کہ اگر ہندستان کو آزاد ہونا ہے تو ہمیں غیر ملکی کپڑے چھوڑنے پڑیں گے۔ بہت سے لوگوں نے ان کی بات مانی۔ اپنی قمیصیں اُتاریں، اپنی پتلونیں، ٹائیاں اور ہیٹ گاندھی جی کے پیروں کے پاس ڈھیر میں ڈال دیے۔ اس کے بعد اس ڈھیر کو آگ لگا دی گئی۔ یہ ہلچل کا زمانہ تھا۔ ہندستان بھر میں غیر ملکی کپڑوں کے ڈھیر جلائے جا رہے تھے۔ لوگ کھادی پہننے کا عہد کر رہے تھے۔ ہزاروں لوگ گرفتار کر لیے گئے۔ جلسے، جلوس زبردستی منتشر کیے جا رہے تھے۔ لیکن سبھی ستیہ گرہی پرامن سول نافرمانی اور عدم تعاون کے اصول سیکھ نہ سکے تھے۔ تشدد بھڑک اُٹھا۔ گاندھی جی کے لیے عدم تشدد بہت ہی اہم تھا۔ انھوں نے تحریک واپس لے لی۔

اس کے فوراً بعد انھیں گرفتار کرلیا گیا۔ اور چھ سال قید کی سزا سنائی گئی۔ لیکن خراب صحت کی بنا پر سزا کی مدت پوری ہونے سے پہلے ہی انھیں رہا کر دیا گیا۔ جیل میں انھیں فرصت ملی کہ وہ آئندہ پروگرام طے کرسکیں۔ انھیں اندازہ ہوا کہ آزادی کے لیے ضروری ہے کہ غربت اور سماجی برائیوں کو دور کیا جائے۔

انھوں نے گاؤں کے لوگوں کی مالی حالت کو نئے سرے سے ترتیب دینے کا پروگرام بنایا۔ انھوں نے چرخے یا تکلی پر ہاتھ سے سوت کاتنے اور کپڑے کی بُنائی کو پھر سے شروع کرنے کی سوچی۔ وہ ذات پات کے نظام اور چھوت چھات کو ختم کرنا چاہتے تھے۔

انھیں معلوم تھا کہ انگریز ہندستانیوں کو فرقوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے کام کرنا طے کیا۔

جس زمانے میں گاندھی جی ان سماجی اصلاحات میں مصروف تھے، پنڈت جواہر لال نہرو جیسے نوجوان لیڈروں کا خیال تھا کہ ہم آزادی کی طرف بہت سست رفتار سے بڑھ رہے ہیں۔ گاندھی جی نے ان سے اتفاق کیا، ''اگر 31 دسمبر 1929 تک ہندستان کو اندرونی آزادی (Dominion Status) نہ ملی تو میں خود کو'' آزادی والا''، ہونے کا اعلان کردوں گا۔

ڈومینین اسٹیٹس (Dominion Status) کا مطلب ہے، انگلستان سے رشتہ توڑے بغیر آسٹریلیا اور کینیڈا جیسی اندرونی آزادی۔

گاندھی جی انڈین نیشنل کانگریس کے کوئی عہدیدار نہ تھے۔ لیکن اس پارٹی کے لیڈر آزادی کی جدوجہد میں ان کے مشوروں اور رہنمائی کے مطابق کام کرتے تھے۔ 31 دسمبر 1929 کو کانگریس نے اعلان کیا کہ ڈومینین اسٹیٹس کافی نہیں ہے۔ پورن سوراج یعنی مکمل آزادی چاہیے۔ پارٹی نے طے کیا کہ 26 جنوری کو مکمل آزادی کا دن منایا جائے۔

26 جنوری 1930 کو پورے ملک میں عام جلسے ہوئے۔ اور گاندھی جی کی تیار کی ہوئی تجویز منظور ہوئی۔ وہ تجویز تھی،'' ہمیں یقین ہے کہ دنیا کے سب لوگوں کی طرح ہندستانیوں کو بھی آزادی کی زندگی بسر کرنے اور اپنی محنت کا پھل پانے اور زندگی کی ضرورتیں پورا کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہم اس پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے لیے آزادی حاصل کرنے کا ذریعہ تشدد نہیں ہے۔ اس لیے ہم جہاں تک ممکن ہوگا، انگریزی حکومت سے سارے رشتے توڑ لیں گے۔ اور سول نافرمانی کا راستہ اختیار کریں گے۔ اس نافرمانی میں ٹیکس ادا نہ کرنا بھی شامل ہوگا۔ ہمیں یقین ہے کہ ٹیکس ادا نہ کرنا اور حکومت کے ساتھ عدم تعاون تشدد کے بغیر بھی ممکن ہے۔ چاہے ہمیں تشدد کے لیے کتنا ہی مجبور کیا جائے۔ اس غیر انسانی حکومت کا خاتمہ یقینی ہے۔''

گاندھی جی احمد آباد کے قریب سابرمتی دریا کے پاس اپنے آشرم میں چلے گئے تاکہ ایسی جدوجہد کا منصوبہ تیار کریں جس سے آزادی حاصل کی جاسکے۔ وہ جانتے تھے کہ سول نافرمانی کی تحریک کی رہنمائی انھی کو کرنی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں لیکن بہر حال وہ تشدد سے پرہیز کریں۔

یہ آسان کام نہیں تھا۔ لوگ انگریزی حکومت سے تنگ آ چکے تھے۔ فضا میں تشدد کی گرمی تھی۔ وائسرائے لارڈ اروِن دہلی واپس آ رہے تھے۔ ایک دہشت پسند نے ان کی ٹرین کے نیچے ایک بم لگایا۔ بم پھٹا لیکن وائسرائے محفوظ رہے۔ اس سے لوگوں کے موڈ کا اندازہ ہوتا ہے۔ گاندھی جی نے اس کارروائی کی مذمت کی اور لوگوں سے عدم تشدد کے راستے پر چل کر تعمیری کاموں پر توجہ دینے کی درخواست کی۔

مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور، گاندھی جی کے آشرم میں ان سے ملے اور گاندھی جی کے منصوبے کے بارے میں پوچھا۔ گاندھی جی نے صرف اتنا بتایا،'' میں ہر وقت یہی سوچ رہا ہوں لیکن تاریک فضا میں روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آ رہی۔'' وہ ایک ایسے مسئلے کی تلاش میں تھے جو سب کے لیے اہم ہو، جو برائی اور ناانصافی کو سب پر واضح کرے۔

وہ چھ ہفتے تک اس پر سوچتے رہے پھر انھوں نے اپنے دل کی آواز سنی جو کہہ رہی تھی کہ نمک قانون کی خلاف ورزی کی جائے۔

یہ فیصلہ عقل و دانش کا ایک کرشمہ تھا۔ گاندھی جی کے لیے نمک کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ کئی سال پہلے وہ نمک چھوڑ چکے تھے۔ لیکن اس مسئلے کو آزادی کی جدوجہد کی بنیاد بنایا۔ انھوں نے ہندستان کے لوگوں اور غیر ملکیوں کو مسئلے کی اہمیت سمجھائی۔ انگریزی حکومت کی ناانصافی کا انھیں یقین ہوگیا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ہمارے رہنما (جلد اوّل)

اس جلد میں بنکم چندر چٹرجی، اینی بیسنٹ، سبھاش چندر بوس، سروجنی نائیڈو، مولانا ابوالکلام آزاد، سی وی رمن، کملا نہرو اور لال بہادر شاستری کی داستانِ حیات پیش کی گئی ہے۔

مترجم: اقبال مہدی زیدی

صفحات: 149، قیمت: -/35 روپے

ہمارے رہنما (جلد دوم)

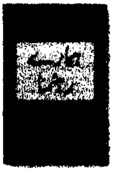

اس جلد میں لوک مانیہ تلک، فضا صاحب کر دے، دہو مہرپنے الاجپت رائے، شری دربند، ولبھ بھائی پٹیل، سیّد علیہ محمد علی اور ڈاکٹر راجندر پرشاد سے متعارف کرایا گیا ہے۔

مترجم: سید اصغر رضوی

صفحات: 172، قیمت: -/35 روپے

ہمارے رہنما (جلد سوم)

اس جلد میں راجا رام موہن رائے، کیشب چندر سین، سریندر ناتھ بینرجی، وی او چدامبرم پلائی، سری نواسا راماانجن، سردار ادھاکرشنن، راج کماری امرت کور اور جے پرکاش نرائن سے متعارف کرایا گیا ہے۔

مترجم: غلام حیدر

صفحات: 192، قیمت: -/35 روپے

ہمارے رہنما (جلد چہارم)

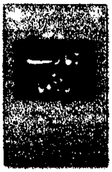

اس جلد میں دیانند سرسوتی، رابندر ناتھ ٹیگور، گووند ولبھ پنت اور رام منوہر لوہیا سے متعارف کرایا گیا ہے۔

مترجم: غلام حیدر

صفحات: 108، قیمت: -/35 روپے

ہمارے رہنما (جلد پنجم)

اس جلد میں گوپال کرشن گوکھلے، وی ایس سری نواسا شاستری، خان عبد الغفار خاں اور میگھ ناد ساہا سے متعارف کرایا گیا ہے۔

مترجم: رفیق محمد شاستری

صفحات: 107، قیمت: -/35 روپے

ہمارے رہنما (جلد ششم)

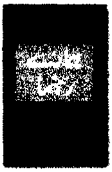

اس جلد میں دادا بھائی نوروجی، چترنجن داس، راش بہاری بوس، ایس ستیہ مورتی، بی آر امبیڈکر اور کملا دیوی چٹوپادھیائے سے متعارف کرایا گیا ہے۔

مترجم: محمد عمر برنی

صفحات: 128، قیمت: -/35 روپے

ہمارے رہنما (جلد ہفتم)

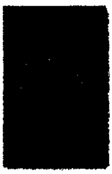

اس جلد میں مہادیو گووند راناڈے، محمد اقبال، بھولا بھائی ڈیسائی، بدھان چندر رائے، دوارکا ناتھ داس اور ساور کر اور کے کامراج سے متعارف کرایا گیا ہے۔

مترجم: فرحت قمر

صفحات: 149، قیمت: -/35 روپے

ہمارے رہنما (جلد ہشتم)

اس جلد میں بپن چندر پال، جگدیش چندر بوس، کستوربا گاندھی، وٹھل بھائی پٹیل، رفیع احمد قدوائی، ونوبا بھاوے، شیاما پرساد مکرجی اور ہومی جہانگیر بھابھا سے متعارف کرایا گیا ہے۔

مترجم: منصور نقوی

صفحات: 161، قیمت: -/35 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

RNI No. 70323/99

DL-15052 / 2003-5

URDU DUNIYA Monthly, October 2003, Vol. 5, Issue: 10

National Council for Promotion of Urdu Language

Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India, New Delhi

قومی اردو کونسل نے چلڈرن بک ٹرسٹ اور بچوں کا ادبی ٹرسٹ کے اشتراک سے بچوں کی ذہنی تربیت کو مدنظر رکھتے ہوئے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہیں۔ ان کتابوں سے بچوں کی تفریح بھی ہوتی ہے اور ان کی معلومات میں اضافہ بھی۔ کتابوں میں دی گئی خوبصورت تصاویر بچوں کو بے حد پسند آئیں گی۔

گاندھی کی کہانی

مصنف: راجکماری شنکر/مترجم: نامی انصاری

اس کتاب میں باپو کے قومی کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ بھی عام فہم زبان میں درج کی گئی ہے۔ گاندھی جی اور ان سے متعلق دیگر افراد کی تصویریں بھی کتاب میں موجود ہیں۔

صفحات: 120، قیمت: -/35 روپے

بچوں کے نہرو

ایم. چالاپاتھی راؤ/مترجم: نامی انصاری

پنڈت جواہر لال نہرو بچوں کو بے حد پیار کرتے تھے اور اس لیے بچے انھیں چاچا نہرو کہتے تھے۔ اس کتاب میں جدید ہندوستان کے اس معمار کی حیات اور شخصیت کے تمام گوشوں پر نظر ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 112، قیمت: -/32 روپے

اندرا پریہ درشنی

مصنف: اکا شنکر/مترجم: عتیق مظفر پوری

اس کتاب میں تقریباً تین دہائیوں تک ہندوستانی سیاست پر چھائی رہنے والی اندرا گاندھی کی شخصیت اور زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 142، قیمت: -/45 روپے

شنکر

مصنف: اکا شنکر/مترجم: انیس اعظمی

[illegible]

صفحات: 128، قیمت: [illegible] روپے

ہندستانی تاریخ سے داستانیں

مصنف: اے. کے. گھوش/مترجم: محمد علیم

داستانیں جہاں تفریح طبع کا سامان فراہم کرتی ہیں وہیں ہماری قدیم تہذیب و ثقافت سے بھی واقف کراتی ہیں۔ اس کتاب میں ہندستانی تاریخ سے ماخوذ داستانیں پیش کی گئی ہیں۔

صفحات: 65، قیمت: -/25 روپے

24 مختصر کہانیاں

مترجم: عارف نقوی

بچوں کے لیے بے حد دلچسپ کہانیاں [illegible] ساتھ ساتھ معلومات میں اضافہ بھی کرتی ہیں [illegible] میں [illegible]

صفحات: 184، قیمت: 40(?) روپے

جانوروں کی دنیا

مصنفین: کرنل اے. ڈیوڈ، شیو کمار/مترجم: انیس اعظمی

مختلف قسم کے جانوروں کے وجود سے نہ صرف ہماری دنیا کا حسن قائم ہے بلکہ مختلف صورتوں میں ہم ان سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ اس کتاب میں 66 جانوروں سے متعلق تفصیلی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ ساتھ ہی ان کی رنگین تصویریں بھی دی گئی ہیں۔

صفحات: 80، قیمت: -/55 روپے

سمندر کی پکار

مصنفین: پی. لکشمی راجن، پی. کارتھی کیان

مترجم: حیدر جعفری سید

[illegible]

صفحات: 104، قیمت: -/37 روپے

نوٹ -: طالب علموں اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

Printed and Published by Director, NCPUL on behalf of NCPUL, Printed at J.K. Offset Printers, Jama Masjid, Delhi-110006 and Published at NCPUL, West Block-I, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110 066, Editor Dr. M. Hamidullah Bhat. Tel : 26103381, 26103938